اصلاحی خطبات

جلد ۷

- گناہوں کی لذّت، ایک دھوکہ
- گناہ گار سے نفرت مت کیجئے
- بیماری اور پریشانی ایک نعمت
- سودی نظام کی خرابیاں اور اس کا متبادل
- تقدیر پر راضی رہنا چاہیئے
- مرنے سے پہلے موت کی تیاری کیجئے
- اپنی فکر کریں
- دینی مدارس دین کی حفاظت کے قلعے
- حلال روزگار نہ چھوڑیں
- سنت کا مذاق نہ اُڑائیں
- فتنہ کے دور کی نشانیاں
- غیر ضروری سوالات سے پرہیز کریں
- معاملاتِ جدیدہ اور علماء کی ذمّہ داریاں

حضرت مولانا مُفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

میمن اسلامک پبلشرز

اصلاحی خطبات

۷

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب ☜ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم
ضبط و ترتیب ☜ مولانا محمد عبداللہ میمن صاحب
تاریخ اشاعت ☜ مئی ۱۹۹۷ء
مقام ☜ جامع مسجد بیت المکرم، گلشن اقبال، کراچی
باہتمام ☜ ولی اللہ میمن ۴۹۱۶۰۳۳ ☎
ناشر ☜ میمن اسلامک پبلشرز
کمپوزنگ ☜ عبدالماجد پراچہ (فون: 0333-2110941)
قیمت ☜ /- روپے

ملنے کے پتے

- میمن اسلامک پبلشرز، ۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹
- دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی
- مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴
- ادارۃ المعارف، دارالعلوم کراچی ۱۴
- کتب خانہ مظہری، گلشن اقبال، کراچی
- اقبال بک سینٹر صدر کراچی
- مکتبۃ الاسلام، الٰہی فلور مل، کورنگی، کراچی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ط

پیش لفظ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی

الحمدللّٰہ و کفی، وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔ امابعد!

اپنے بعض بزرگوں کے ارشاد کی تعمیل میں احقر کئی سال سے جمعہ کے روز عصر کے بعد جامع مسجد البیت المکرّم گلشن اقبال کراچی میں اپنے اور سننے والوں کے فائدے کے لئے کچھ دین کی باتیں کیا کرتا ہے۔ اس مجلس میں ہر طبقہ خیال کے حضرات اور خواتین شریک ہوتے ہیں، الحمد للہ احقر کو ذاتی طور پر بھی اس کا فائدہ ہوتا ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ سامعین بھی فائدہ محسوس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو ہم سب کی اصلاح کا ذریعہ بنائیں۔ آمین۔

احقر کے معاون خصوصی مولانا عبداللہ میمن صاحب سلمہ نے کچھ عرصے سے احقر کے ان بیانات کو ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے محفوظ کر کے ان کے کیسٹ تیار کرنے اور ان کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جس کے بارے میں دوستوں سے معلوم ہوا کہ بفضلہٖ تعالیٰ ان سے بھی مسلمانوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔

ان کیسٹوں کی تعداد اب غالباً دوسو سے زائد ہوگئی ہے۔ انہی میں سے کچھ کیسٹوں کی تقاریر مولانا عبداللہ میمن صاحب سلمہ نے قلمبند بھی فرمالیں اور ان کو چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں شائع کیا۔ اب وہ ان تقاریر کا ایک

مجموعہ ''اصلاحی خطبات'' کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔

ان میں سے بعض تقاریر پر احقر نے نظر ثانی بھی کی ہے۔ اور مولانا موصوف نے ایک مفید کام یہ بھی کیا ہے کہ تقاریر میں جو احادیث آتی ہیں، ان کی تخریج کر کے ان کے حوالے بھی درج کر دیئے ہیں، اور اس طرح ان کی افادیت بڑھ گئی ہے۔

اس کتاب کے مطالعے کے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے، بلکہ تقریروں کی تلخیص ہے جو کیسٹوں کی مدد سے تیار کی گئی ہے، لہٰذا اس کا اسلوب تحریری نہیں، بلکہ خطابی ہے۔ اگر کسی مسلمان کو ان باتوں سے فائدہ پہنچے تو یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، اور اگر کوئی بات غیر محتاط یا غیر مفید ہے، تو وہ یقیناً احقر کی کسی غلطی یا کوتاہی کی وجہ سے ہے۔ لیکن الحمد للہ ان بیانات کا مقصد تقریر برائے تقریر نہیں، بلکہ سب سے پہلے اپنے آپ کو اور پھر سامعین کو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

نہ بہ حرف ساختہ سر خوشم، نہ بہ نقش بستہ مشوشم
نفسے بیاد تو می زنم، چہ عبارت وچہ معانیم

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ان خطبات کو خود احقر کی اور تمام قارئین کی اصلاح کا ذریعہ بنائیں، اور یہ ہم سب کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے مزید دعا ہے کہ وہ ان خطبات کے مرتب اور ناشر کو بھی اس خدمت کا بہترین صلہ عطا فرمائیں آمین۔

محمد تقی عثمانی
۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۱۴ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

عرضِ ناشر

الحمد للہ ''اصلاحی خطبات'' کی ساتویں جلد آپ تک پہنچانے کی ہم سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ چھٹی جلد کی مقبولیت اور افادیت کے بعد مختلف حضرات کی طرف سے ساتویں جلد کو جلد از جلد شائع کرنے کا شدید تقاضہ ہوا، اور اب الحمد للہ، دن رات کی محنت اور کوشش کے نتیجے میں صرف چھ ماہ کے اندر یہ جلد تیار ہو کر سامنے آ گئی، اس جلد کی تیاری میں برادر مکرم جناب مولانا عبداللہ میمن صاحب نے اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ اس کام کے لئے اپنا قیمتی وقت نکالا، اور دن رات کی انتھک محنت اور کوشش کر کے ساتویں جلد کے لئے مواد تیار کیا، اللہ تعالیٰ ان کی صحت اور عمر میں برکت عطا فرمائے۔ اور مزید آگے کام جاری رکھنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ہم جامعہ دارالعلوم کراچی کے استاد حدیث جناب مولانا محمود اشرف عثمانی صاحب مدظلہم اور مولانا راحت علی ہاشمی صاحب مدظلہم کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر اس پر نظر ثانی فرمائی اور مفید مشورے دیئے، اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں ان حضرات کو اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین۔

تمام قارئین سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو مزید آگے جاری رکھنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے اور اس کے لئے وسائل اور اسباب میں آسانی پیدا فرما دے اور اس کام کو اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ولی اللہ میمن
میمن اسلامک پبلشرز

اجمالی فہرست

جلد ۷

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر
❖ اللہ کا وعدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا ہے	۳۷
❖ اب تو اس دل کو تیرے قابل بنانا ہے مجھے	۳۸
❖ ماں یہ تکلیف کیوں برداشت کرتی ہے؟	۳۹
❖ محبت تکلیف کو ختم کردیتی ہے	۳۹
❖ مولیٰ کی محبت لیلیٰ سے کم نہ ہو	۴۰
❖ تنخواہ سے محبت ہے	۴۱
❖ عبادت کی لذت سے آشنا کردو	۴۲
❖ حضرت سفیان ثوریؒ کا فرمان	۴۲
❖ مجھے تو دن رات بے خودی چاہئے	۴۳
❖ نفس کو کچلنے میں مزہ آئے گا	۴۳
❖ ایمان کی حلاوت حاصل کرلو	۴۴
❖ حاصل تصوف	۴۴
❖ دل تو ہے ٹوٹنے کے لئے	۴۵
اپنی فکر کریں	
❖ ایک آیت پر عمل	۵۰
❖ مسلمانوں کی بدحالی کا سبب	۵۰
❖ کوششیں رائیگاں کیوں؟	۵۲
❖ اصلاح کا آغاز دوسروں سے	۵۲
❖ اپنی اصلاح کی فکر نہیں	۵۳

بیماری اور پریشانی ایک نعمت

سُنّت کا مذاق نہ اڑائیں

تقدیر پر راضی رہنا چاہئے

فتنہ کے دور کی نشانیاں

صفحہ نمبر	عنوان

مرنے سے پہلے موت کی تیاری کیجئے

صفحہ نمبر	عنوان
۲۸۵	❖ ندامت اور توبہ کے ذریعہ درجات کی بلندی
۲۸۶	❖ ایسی تیسی میرے گناہوں کی
۲۸۶	❖ نفس سے زندگی بھر کی لڑائی ہے
۲۸۷	❖ تم قدم بڑھاؤ۔ اللہ تعالیٰ تھام لیں گے
۲۸۸	❖ اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دو گے؟
۲۸۹	❖ ہمت اور حوصلہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو
۲۹۰	❖ اُن کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

غیر ضروری سوالات سے پرہیز کریں

صفحہ نمبر	عنوان
۲۹۴	کثرت سوال کا نتیجہ۔
۲۹۴	کس قسم کے سوالات سے پرہیز کیا جائے۔
۲۹۵	فضول سوالات میں لگانا شیطان کا کام ہے۔
۲۹۶	حکم شرعی کی علت کے بارے میں سوال۔
۲۹۶	علت کے بارے میں سوال کا بہترین جواب۔
۲۹۷	اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں میں دخل مت دو۔
۲۹۸	صحابہ کرامؓ "کیوں" سے سوال نہیں کیا کرتے تھے۔
۲۹۸	یہ اللہ کی محبت اور عظمت کی کمی کی دلیل ہے۔

معاملات جدیدہ اور علماء کی ذمہ داریاں

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

گناہوں کی

لذّت ایک دھوکہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۲۷ر ستمبر ۱۹۹۱ء

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گناہوں کی لذّت ایک دھوکہ

الحمدلله نحمده ونستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيات اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له ونشهدان سيدنا وسندنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى اله واصحابه وبارك وسلم تسليماكثيرا كثيرا۔

امابعد!

﴿عن ابی هريرة رضی الله عنه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: حجبت النار بالشهوات وحجبت الجنة بالمكاره﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: دوزخ پر خواہشاتِ نفسانی کا پردہ پڑا ہوا ہے اور جنّت پر ان چیزوں کا پردہ پڑا ہوا ہے جن کو انسان دنیا کے اندر مشکل اور پُرمشقت محسوس کرتا ہے اور ناپسندیدہ سمجھتا ہے۔

جنّت اور جہنّم پردے میں

اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے امتحان اور آزمائش کا گھر بنایا ہے اس آزمائش کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنی عقل اور سمجھ استعمال کر کے اس امتحان میں کامیابی حاصل کرے۔ اگر

دوزخ سامنے کردی جاتی کہ دیکھو یہ دوزخ ہے اور اس میں آگ بھڑک رہی ہے اور اس عذاب کا مشاہدہ ہو جاتا۔ اور دوسری طرف جنت سامنے کردی جاتی کہ اس جنت کی نعمتیں اور اس کے پُرکیف مناظر سامنے ہوتے، اور پھر انسان سے کہا جاتا کہ تم ان دونوں مقامات میں سے ایک مقام کو اپنے لئے اختیار کرلو اور اس کے راستے پر چل پڑو۔ پھر تو یہ امتحان نہ ہوتا۔ یہ امتحان اس طرح رکھا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت بھی پیدا فرمائی اور جہنم بھی پیدا فرمائی۔ لیکن جہنم پر نفسانی خواہشات کا پردہ ڈال دیا اور وہ نفسانی خواہشات انسان کو جہنم کی طرف لے جانا چاہتی ہیں۔ مثلاً دل چاہتا ہے کہ فلاں کام کرلوں حالانکہ وہ کام دوزخ میں لے جانے والا ہے۔ اور دوسری طرف جنت پر مکروہات کا پردہ ڈال دیا اور ایسی چیزوں کا پردہ ڈال دیا جن کو انسان کا نفس بُرا سمجھتا ہے۔ مثلاً یہ کہ صبح سویرے اٹھو، اپنی نیند کو چھوڑو، مسجد کی طرف جاؤ، نماز فجر ادا کرو، ذکر کرو، گناہوں کو چھوڑو۔ اب انسان کا نفس ان باتوں کو بظاہر بُرا سمجھتا ہے لیکن جنت کو ان کے پیچھے چھپادیا گیا ہے اور اس پر ان کا پردہ ڈال دیا ہے۔

جہنم کے انگارے خریدنے والا

جتنی چیزیں نفسانی شہوات سے متعلق ہیں۔ اگر انسان ان کے پیچھے اس طرح چل پڑے کہ جو جی میں آئے کر گزرے اور یہ نہ دیکھے کہ یہ کام حلال ہے یا حرام ہے، جائز ہے یا ناجائز ہے تو اس صورت میں یہ راستہ سیدھا جہنم کی طرف لے جائے گا۔ مثلاً انسان کا دل کھیل تماشوں کی طرف بہت مائل ہوتا ہے۔ پہلے زمانے میں تو کھیل تماشوں کے لئے باقاعدہ جگہیں مقرر ہوتی تھیں۔ وہاں جانا پڑتا تھا۔ ٹکٹ خریدنا پڑتا تھا۔ لیکن اب تو گھر گھر میں کھیل تماشے ہو رہے ہیں۔ یہ سب شہوتیں ہیں اور نفسانی خواہشات ہیں۔ جن کو پورا کرنے کے لئے انسان پیسے خرچ کر رہا ہے۔ اور پیسے خرچ کرکے بازار جاکر دوڑ دھوپ کرکے محنت اور مشقت برداشت کرکے کھیل تماشوں کا سامان خرید رہا ہے۔ گویا اپنے گھر کے اندر، اپنے ڈرائنگ روم میں، اپنے بیڈ روم میں اور اپنے بچوں

کے لئے دوزخ کے انگارے خرید کر لا رہا ہے۔ جنّت کا سامان کرنے کے بجائے جہنّم کا سامان کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کر رہا ہے کہ خواہشات کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اگر یہ پردہ اٹھ جائے اور حقیقت شناس نگاہ پیدا ہو جائے تو اس وقت معلوم ہوگا کہ میں یہ سارے کام جو کر رہا ہوں در حقیقت جہنّم میں لے جانے والے کام ہیں۔

جنّت کی طرف جانے والا راستہ

دوسری طرف جنّت کے اوپر مکروہات اور ناپسندیدہ چیزوں کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ انسان کا نفس یہ نہیں چاہتا کہ عبادات اور طاعات کی طرف چلے۔ اللہ تعالیٰ کے حکموں کو مانے، لیکن یہی راستہ جنّت کی طرف لے جانے والا ہے۔ جو آدمی ایک مرتبہ ہمت کر کے شہوات کے راستے سے اپنے آپ کو بچالے۔ اور اس راستے پر چل پڑے جو بظاہر پُر مشقت نظر آرہا ہے تو وہ انسان سیدھا جنّت میں چلا جائے گا۔

ہر خواہش کو پورا کرنے کی فکر

اس حدیث سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ کبھی خواہشاتِ نفس کے دھوکے میں مت پڑو اس لئے کہ یہ خواہشاتِ نفس ایسی چیز ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اور دنیا کے اندر کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو یہ کہے کہ میں جو کچھ خواہش کرتا ہوں وہ پوری ہو جاتی ہے۔ دنیا میں کوئی انسان چاہے وہ بڑے سے بڑا سرمایہ دار ہو۔ بڑے سے بڑا بادشاہ ہو۔ بڑے سے بڑا صاحب اقتدار ہو۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے، اس کو بھی تکلیف اور صدمہ پہنچتا ہے۔ یہ دنیا مستقل راحت کی جگہ نہیں ہے اس لئے اس دنیا میں تکلیف تو پہنچتی ہے۔ اب تمہاری مرضی ہے کہ چاہو تو زبردستی اپنے نفس کو تکلیف پہنچالو یا اللہ کو راضی کرنے کے لئے اپنے نفس کو تکلیف پہنچاؤ اور یہ ارادہ کرلو کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کام سے منع کیا ہے اس لئے میں اپنے نفس کو اس کام سے

باز رکھوں گا۔ پہلا راستہ جہنّم کی طرف لے جانے والا ہے اور دوسرا راستہ جنّت کی طرف لے جانے والا ہے۔ لہٰذا یہ عادت جو پڑگئی ہے کہ جو خواہش بھی پیدا ہو وہ ضرور پوری ہوجائے اور اس خواہش کے پورا نہ ہونے کی صورت میں وہ غمگین اور پریشان ورہاہے۔ یہ عادت ختم کرو۔ اس لئے کہ یہ عادت جہنّم کی طرف لے جانے والی ہے۔

انسان کا نفس لذّتوں کا خوگر ہے

ہمارا اور آپ کا نفس یعنی وہ قوت جو انسان کو کسی کام کے کرنے کی طرف اُبھارتی ہے وہ نفس دنیاوی لذّتوں کا عادی بنا ہوا ہے۔ لہٰذا جس کام میں اس کو ظاہری لذّت اور مزہ آتا ہے اس کی طرف یہ دوڑتا ہے، یہ اس کی جبلّت اور خصلت ہے کہ ایسے کاموں کی طرف انسان کو مائل کرے، یہ انسان سے کہتا ہے کہ یہ کام کرلو تو مزہ آجائے گا، یہ کام کرلو تو لذّت حاصل ہوجائے گی۔ لہٰذا یہ نفس انسان کے دل میں خواہشات کے تقاضے پیدا کرتا رہتا ہے۔ اب اگر انسان اپنے نفس کو بے لگام اور بے مہار چھوڑ دے اور جو بھی لذّت کے حصول کا تقاضہ پیدا ہو اس پر عمل کرتا جائے اور نفس کی ہر بات مانتا جائے تو اس کے نتیجے میں پھر وہ انسان انسان نہیں رہتا بلکہ جانور بن جاتا ہے۔

خواہشاتِ نفسانی میں سکون نہیں

نفسانی خواہشات کا اصول یہ ہے کہ اگر ان کی پیروی کرتے جاؤ گے اور ان کے پیچھے چلتے جاؤ گے اور اس کی باتیں مانتے جاؤ گے تو پھر کسی حد پر جاکر قرار نہیں آئے گا، انسان کا نفس کبھی یہ نہیں کہے گا کہ اب ساری خواہشات پوری ہوگئیں اب مجھے کچھ نہیں چاہئے، یہ کبھی زندگی بھر نہیں ہوگا، اس لئے کہ کسی انسان کی ساری خواہشات اس کی زندگی میں پوری نہیں ہوسکتیں اور اس کے ذریعہ کبھی قرار اور سکون نصیب نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں نفس کے ہر تقاضے پر عمل کرتا جاؤں اور ہر خواہش پوری کرتا جاؤں تو کبھی اس شخص کو قرار نہیں آئے گا۔

کیوں؟ اس لئے کہ اس نفس کی خاصیت یہ ہے کہ ایک لطف اٹھانے کے بعد اور ایک مرتبہ لذّت حاصل کر لینے کے بعد یہ فوراً دوسری لذت کی طرف بڑھتا ہے۔ لہٰذا اگر تم چاہتے ہو کہ نفسانی خواہشات کے پیچھے چل چل کر سکون حاصل کر لیں تو ساری عمر بھی سکون نہیں ملے گا، تجربہ کر کے دیکھ لو۔

لطف اور لذّت کی کوئی حد نہیں ہے

آج جن کو ترقی یافتہ اقوام کہا جاتا ہے انہوں نے یہ ہی کہا ہے کہ انسان کی پرائیویٹ زندگی میں کوئی دخل اندازی نہ کرو، جس کی مرضی میں جو کچھ آرہا ہے وہ اس کو کرنے دو، اور جس شخص کو جس کام میں مزہ آرہا ہے وہ اسے کرنے دو، نہ اس کا ہاتھ روکو اور نہ اس پر کوئی پابندی لگاؤ اور اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کرو۔ چنانچہ آپ دیکھ لیں کہ آج انسان کو لطف حاصل کرنے اور مزہ حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں، نہ قانون کی رکاوٹ، نہ مذہب کی رکاوٹ، نہ اخلاق کی رکاوٹ، نہ معاشرے کی رکاوٹ ہے، کوئی پابندی نہیں ہے اور ہر شخص وہ کام کر رہا ہے جو اس کی مرضی میں آرہا ہے۔ اور اگر اس شخص سے کوئی پوچھے کہ کیا تمہارا مقصد حاصل ہو گیا؟ تم جتنا لطف اس دنیا سے حاصل کرنا چاہتے تھے کیا لطف کی وہ آخری منزل اور مزے کا وہ آخری درجہ تمہیں حاصل ہو گیا، جس کے بعد تمہیں اور کچھ نہیں چاہئے؟ کوئی شخص بھی اس سوال کا "ہاں" میں جواب نہیں دے گا، بلکہ ہر شخص یہی کہے گا کہ مجھے اور مل جائے، مجھے اور مل جائے، آگے بڑھتا چلا جاؤں۔ اس لئے کہ ایک خواہش دوسری خواہش کو اُبھارتی رہتی ہے۔

علانیہ زناکاری

مغربی معاشرے میں ایک مرد اور ایک عورت آپس میں ایک دوسرے سے جنسی لذت حاصل کرنا چاہیں تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے جاؤ کوئی رکاوٹ

نہیں، کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ حد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ارشاد فرمایا تھا وہ آنکھوں نے دیکھ لیا، آپ نے فرمایا تھا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ زنا اس قدر عام ہو جائے گا کہ دنیا میں سب سے نیک شخص وہ ہو گا کہ دو آدمی ایک سڑک کے چوراہے پر بدکاری کا ارتکاب کر رہے ہوں گے، وہ شخص آکر ان سے کہے گا کہ اس درخت کی اوٹ میں کرلو، وہ ان کو اس کام سے منع نہیں کرے گا کہ یہ کام بُرا ہے، بلکہ وہ یہ کہے گا کہ یہاں سب کے سامنے کرنے کے بجائے اس درخت کی اوٹ میں جاکر کرلو، وہ کہنے والا شخص سب سے نیک آدمی ہو گا۔ آج وہ زمانہ تقریباً آچکا ہے، آج کھلم کھلا بغیر کسی رکاوٹ اور پردے کے یہ کام ہو رہا ہے۔

امریکہ میں "زنا بالجبر" کی کثرت کیوں؟

لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے جنسی جذبات کو تسکین دینے کے لئے حرام طریقہ اختیار کرنا چاہے تو اس کے لئے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود "زنا بالجبر" کے واقعات جتنے امریکہ میں ہوتے ہیں دنیا میں اور کہیں نہیں ہوتے، حالانکہ رضامندی کے ساتھ یہ کام کرنے کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں، جو آدمی جس طرح چاہے اپنے جذبات کو تسکین دے سکتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ رضامندی کے ساتھ زنا کرکے دیکھ لیا، اس میں جو مزہ تھا وہ حاصل کرلیا، لیکن اس کے بعد اس میں بھی قرار نہ آیا تو اب باقاعدہ یہ جذبہ پیدا ہوا کہ یہ کام زبردستی کرو تاکہ زبردستی کرنے کا جو مزہ ہے وہ بھی حاصل ہو جائے۔ لہٰذا یہ انسانی خواہشات کسی مرحلے پر جاکر رکتی نہیں ہیں، بلکہ اور آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں اور یہ ہوس کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

یہ پیاس بجھنے والی نہیں

آپ نے ایک بیماری کا نام سنا ہو گا جس کو "جوع البقر" کہتے ہیں، اس بیماری کی خاصیت یہ ہے کہ انسان کو بھوک لگتی رہتی ہے، جو دل چاہے کھالے، جتنا چاہے کھالے

مگر بھوک نہیں مٹتی۔ اسی طرح ایک اور بیماری ہے، جس کو "استسقاء" کہا جاتا ہے، اس بیماری میں انسان کو پیاس لگتی رہتی ہے، گھڑے کے گھڑے پی جائے، کنویں بھی ختم کرجائے، مگر پیاس نہیں بجھتی۔ یہی حال انسان کی خواہشات کا ہے، اگر ان کو قابو نہ کیا جائے اور ان پر کنٹرول نہ کیا جائے، اور جب تک ان کو شریعت اور اخلاق کے بندھن میں نہ باندھا جائے، اس وقت تک اس کو "استسقاء" کی بیماری کی طرح لطف ولذّت کے کسی بھی مرحلے پر جاکر قرار نصیب نہیں ہوتا، بلکہ لذّت کی وہ ہوس بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

گناہوں کی لذّت کی مثال

اور پھر گناہوں کے اندر بے شک لذّت موجود ہے، گناہ کرنا بڑا لذیذ معلوم ہوتا ہے اور اس دنیا کے اندر یہی تو آزمائش ہے کہ گناہ دیکھنے میں اچھا لگتا ہے۔ اور دل اس کی طرف کھنچتا ہے۔ اس میں لذّت محسوس ہوتی ہے۔ مزہ آتا ہے۔ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ گناہ کی لذّت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خارش کے مریض کو کھجانے میں مزہ آتا ہے۔ اس میں لذّت محسوس ہوتی ہے۔ اگر اس کو اس کھجانے سے روکا جائے تو وہ باز نہیں آتا۔ لیکن جتنا کھجاؤ گے اتنا ہی اس خارش کی بیماری میں اضافہ ہوگا۔ اب بظاہر تو کھجانے میں لذّت محسوس ہو رہی ہے۔ مزہ آرہا ہے، لیکن کھجا کر فارغ ہونے کے بعد اس جگہ پر جو سوزش اور جلن ہوگی اور تکلیف ہوگی اس کے مقابلے میں وہ وقتی لذّت ہیچ ہے۔ اسی طرح گناہ کی لذّت بھی ایک وقتی اور عارضی اور ظاہری لذّت ہے۔ حقیقی لذّت نہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ اپنے ذکر و فکر کی لذّت عطا فرمادیں اور اپنی یاد کی لذّت عطا فرمادیں اور اس میں منہمک فرمادیں تو وہ ایسی دائمی اور پائیدار لذّت ہے کہ اس کے مقابلے میں گناہ کی لذّت کوئی حقیقت نہیں رکھتی بلکہ ہیچ در ہیچ ہے۔

تھوڑی سی مشقت برداشت کرلو

اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نفسانی خواہشات کے پیچھے مت چلو، ان کا اتباع مت کرو، اس لئے کہ یہ تمہیں ہلاکت کے گڑھے میں لے جاکر ڈال دے گی۔ بلکہ اس کو ذرا قابو میں رکھو اور اس کو کنٹرول کر کے شریعت کی معقول حدود کے اندر رکھو۔ اور اگر تم رکھنا چاہو گے تو شروع شروع میں یہ نفس تمہیں ذرا تنگ کرے گا، تکلیف ہوگی، صدمہ ہوگا، دُکھ ہوگا، ایک کام کو دل چاہ رہا ہے مگر اس کو روک رہے ہیں۔ دل چاہ رہا ہے کہ ٹی وی دیکھیں اور اس میں جو خراب خراب فلمیں آرہی ہیں وہ دیکھیں، یہ نفس کا تقاضہ ہو رہا ہے۔ اب جو آدمی اس کا عادی ہے اس سے کہو کہ اس کو مت دیکھ اور اس نفسانی تقاضہ پر عمل نہ کر تو اگر وہ نہیں دیکھے گا اور آنکھ کو اس سے روکے گا تو شروع میں اس کو دقت ہوگی اور مشقت ہوگی، بُرا لگے گا۔ اس لئے کہ وہ دیکھنے کا عادی ہے اس کو دیکھے بغیر چین نہیں آتا، لطف نہیں آتا۔

یہ نفس کمزور پر شیر ہے

لیکن ساتھ میں اللہ تعالیٰ نے اس نفس کی خاصیت یہ رکھی ہے کہ اگر کوئی شخص اس مشقت اور تکلیف کے باوجود ایک مرتبہ ڈٹ جائے کہ چاہے مشقت ہو یا تکلیف ہو، چاہے دل پر آرے چل جائیں، تب بھی یہ کام نہیں کروں گا، جس دن یہ شخص نفس کے سامنے اس طرح ڈٹ گیا بس اس دن سے یہ نفسانی خواہشات خود بخود ڈھیلی پڑنی شروع ہو جائیں گی۔ یہ نفس اور شیطان کمزور کے اوپر شیر ہیں، جو اس کے سامنے بھیگی بلّی بنا رہے اور اس کے تقاضوں پر چلتا رہے اس کے اوپر یہ چھا جاتا ہے اور غالب آجاتا ہے۔ اور جو شخص ایک مرتبہ پختہ ارادہ کرکے اس کے سامنے ڈٹ گیا کہ میں یہ کام نہیں کروں گا، چاہے کتنا تقاضہ ہو، چاہے دل پر آرے چل جائیں تو پھر یہ نفس ڈھیلا پڑ

جاتا ہے اور اس کام کے نہ کرنے پر پہلے دن جتنی تکلیف ہوئی تھی دوسرے دن اس سے کم ہوگی اور تیسرے دن اس سے کم اور ہوتے ہوتے وہ تکلیف ایک دن بالکل رفع ہوجائے گی اور نفس اس کا عادی بن جائے گا۔

نفس دودھ پیتے بچے کی طرح ہے

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں جن کا "قصیدہ بُردہ" بہت مشہور ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک نعتیہ قصیدہ ہے۔ اس میں انہوں نے ایک عجیب وغریب حکیمانہ شعر کہا ہے ؂

النفس کا لطفل ان تهمله شب علی
حب الرضاع وان تفطمه ينفطم

یہ انسان کا نفس ایک چھوٹے بچے کی طرح ہے جو ماں کا دودھ پیتا ہے اور پھر وہ بچہ دودھ پینے کا عادی بن گیا، اب اگر اس سے دودھ چھڑانے کی کوشش کرو تو وہ بچہ کیا کرے گا؟ روئے گا چلائے گا، شور کرے گا۔ اب اگر ماں باپ یہ سوچیں کہ دودھ چھڑانے سے بچے کو بڑی تکلیف ہورہی ہے چلو چھوڑو، اسے دودھ پینے دو اور وہ بچہ دودھ پیتا رہے۔ تو علامہ بوصیریؒ فرماتے ہیں کہ اگر بچے کو اس طرح دودھ پینے کی حالت میں چھوڑ دیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جوان ہوجائے گا اور اس سے دودھ نہیں چھوٹ پائے گا۔ اس لئے کہ تم اس کی تکلیف، اس کی فریاد اور اس کی چیخ وپکار سے ڈر گئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے دودھ نہیں چھڑا سکے۔ اب اگر اس کے سامنے روٹی لاتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ میں تو نہیں کھاؤں گا۔ میں تو دودھ ہی پیوں گا۔ لیکن دنیا میں کوئی ماں باپ ایسے نہیں ہوں گے جو یہ کہیں کہ چونکہ بچے کو دودھ چھڑانے سے تکلیف ہورہی ہے اس لئے دودھ نہیں چھڑاتے۔ ماں باپ جانتے ہیں کہ بچہ دودھ چھڑانے سے روئے گا، چلائے گا، رات کو نیند نہیں آئے گی۔ خود بھی جاگے گا، ہمیں بھی جگائے گا، لیکن پھر بھی دودھ چھڑاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ بچے کی بھلائی اسی میں

ہے۔ اگر آج اس کو دودھ نہ چھڑایا گیا تو ساری عمر یہ کبھی روٹی کھانے کے لائق نہیں ہو گا۔

اس کو گناہوں کی چاٹ لگی ہوئی ہے

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ انسان کا نفس بھی بچے کی مانند ہے۔ اس کے منہ کو گناہ لگے ہوئے ہیں۔ گناہوں کا ذائقہ اور اس کی چاٹ لگی ہوئی ہے۔ اگر تم نے اس کو ایسے ہی چھوڑ دیا کہ چلو کرنے دو، گناہ چھڑانے سے تکلیف ہوگی۔ نظر غلط جگہ پر پڑتی ہے اور اس کو ہٹانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ زبان کو جھوٹ بولنے کی عادت پڑ گئی ہے، اگر جھوٹ بولنا چھوڑیں گے تو بڑی تکلیف ہوگی۔ اور اس زبان کو مجلسوں کے اندر بیٹھ کر غیبت کرنے کی عادت پڑ گئی ہے، اگر اس کو روکیں گے تو بڑی دقت ہوگی۔ نفس ان باتوں کا عادی بن گیا ہے۔ رشوت لینے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اللہ بچائے، سود کھانے کی عادت پڑ گئی۔ اور بہت سے گناہوں کی عادت پڑ گئی ہے، اور اب ان عادتوں کو چھڑانے سے نفس کو تکلیف ہو رہی ہے، اگر نفس کی اس تکلیف سے گھبرا کر اور ڈر کر بیٹھ گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ساری عمر نہ کبھی گناہ چھوٹیں گے اور نہ قرار ملے گا۔

سکون اللہ کے ذکر میں ہے

یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں قرار اور سکون نہیں ہے، ساری دنیا کے اسباب ووسائل جمع کر لئے لیکن اس کے باوجود سکون نصیب نہیں۔ چین نہیں ملتا۔ میں نے آپ کو ابھی مغربی معاشرے کی مثال دی تھی کہ وہاں پیسے کی ریل پیل، تعلیم کا معیار بلند، لذت حاصل کرنے کے سارے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے کہ جس طرح چاہو لذت حاصل کر لو۔ لیکن اس کے باوجود یہ حال ہے کہ خواب آور گولیاں کھا کھا کر اس کی مدد سے سو رہے ہیں۔ کیوں؟ دل میں سکون و قرار نہیں۔ سکون کیوں نہیں ملا؟ اس

لئے کہ گناہوں میں سکون کہاں تلاش کرتے پھر رہے ہو۔ یاد رکھو! ان گناہوں اور نافرمانیوں اور معصیتوں میں سکون نہیں۔ سکون تو صرف ایک چیز میں ہے اور وہ ہے:

﴿الا بذکر اللہ تطمئن القلوب﴾ (سورۃ الرعد:۲۸)

اللہ کی یاد میں اطمینان اور سکون ہے، اس واسطے یہ سمجھنا دھوکہ ہے کہ نافرمانیاں کرتے جائیں گے اور سکون ملتا جائے گا۔ یاد رکھو! زندگی بھر نہیں ملے گا، اس دنیا سے تڑپ تڑپ کر جاؤ گے، اگر نافرمانیوں کو نہ چھوڑا تو سکون کی منزل حاصل نہ ہوگی۔

سکون اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دیتے ہیں جن کے دل میں اس کی محبت ہو، جن کے دل میں اس کی یاد ہو، جن کا دل اس کے ذکر سے آباد ہو۔ ان کے سکون اور اطمینان کو دیکھو کہ ظاہری طور پر پریشان حال بھی ہیں، فقر و فاقے بھی گزر رہے ہیں، لیکن دل کو سکون اور قرار کی نعمت میسر ہے، لہٰذا اگر دنیا کا بھی سکون حاصل کرنا چاہتے ہو تو ان نافرمانیوں اور گناہوں کو تو چھوڑنا پڑے گا، اور گناہوں کو چھوڑنے کے لئے ذرا سا مجاہدہ کرنا پڑے گا، نفس کے مقابلے میں ذرا سا ڈٹنا پڑے گا۔

اللہ کا وعدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا

اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ بھی فرمالیا کہ:

﴿والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا﴾

جو لوگ ہمارے راستے میں یہ مجاہدہ اور محنت کرتے ہیں کہ ماحول کا، معاشرے کا، نفس کا، شیطان کا اور خواہشات کا تقاضہ چھوڑ کر وہ ہمارے حکم پر چلنا چاہتے ہیں۔ تو ہم کیا کرتے ہیں:

﴿لنھدینھم سبلنا﴾

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کا ترجمہ فرماتے ہیں کہ "ہم ان کے ہاتھ پکڑ کر لے چلیں گے" یہ نہیں کہ دور سے دکھا دیا کہ "یہ راستہ ہے۔" بلکہ فرمایا کہ ہم اس کا ہاتھ

پکڑ کر لے جائیں گے۔ لیکن ذرا کوئی قدم تو بڑھائے، ذرا کوئی ارادہ تو کرے، ذرا کوئی اپنے اس نفس کے مقابلے میں ایک مرتبہ ڈٹے تو سہی، پھر اللہ تعالیٰ کی مدد آتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ جو کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا "مجاہدہ" اسی کا نام ہے کہ ایک مرتبہ آدمی ڈٹ کر ارادہ کرلے کہ یہ کام نہیں کروں گا، دل پر آرے چل جائیں گے، خواہشات پامال ہوجائیں گی، دل ودماغ پر قیامت گزر جائے گی، لیکن یہ گناہ کا کام نہیں کروں گا۔ جس دن نفس کے سامنے ڈٹ گیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس دن سے ہمارا محبوب ہوگیا، اب ہم خود اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے جائیں گے۔

اب تو اس دل کو تیرے قابل بنانا ہے مجھے

اس لئے اصلاح کے راستے میں سب سے پہلا قدم "مجاہدہ" ہے اس کا عزم کرنا ہوگا۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں پامال ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے تیرے قابل مجھے

جو آرزوئیں دل میں پیدا ہورہی ہیں وہ چاہے برباد ہوجائیں، چاہے ان کا خون ہوجائے، اب میں نے تو ارادہ کرلیا ہے کہ اب تو اس کو بنانا ہے تیرے قابل مجھے، اب اس دل میں اللہ جلّ جلالہ کے انوار کا نزول ہوگا، اب اس دل میں اللہ کی مُحبّت جاگزیں ہوگی، اب یہ گناہ نہیں ہوں گے۔ پھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیسی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور آدمی اس راہ پر چل پڑتا ہے۔

یاد رکھو کہ شروع شروع میں تو یہ کام کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے کہ دل تو کچھ چاہ رہا ہے اور اللہ کی خاطر اس کام کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ اس میں بڑی تکلیف ہوتی ہے، لیکن بعد میں اس تکلیف میں ہی مزہ آنے لگتا ہے اور لطف آنے لگتا ہے۔ جب یہ خیال آتا ہے کہ میں نفس کو جو کچل رہا ہوں اور آرزوؤں کو جو خون کر رہا ہوں یہ اپنے

مالک اور خالق کی خاطر کر رہا ہوں تو اس میں جو مزہ اور کیف ہے آپ ابھی اس کا تصور نہیں کرسکتے۔

ماں یہ تکلیف کیوں برداشت کرتی ہے؟

ماں کو دیکھئے کہ اس کی کیا حالت ہوتی ہے کہ سخت سردی کا عالم ہے اور کڑکڑاتے جاڑے کی رات ہے، لحاف میں لیٹی ہوئی ہے اور بچہ پاس پڑا ہے۔ اس حالت میں اس بچے نے پیشاب کردیا، اب نفس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ یہ گرم گرم بستر چھوڑ کر کہاں جاؤں، یہ تو جاڑے کا موسم ہے، گرم گرم بستر چھوڑ کر جانا تو بڑا مشکل کام ہے، لیکن ماں یہ سوچتی ہے کہ اگر میں نہ گئی تو بچہ گیلا پڑا رہے گا، اس کے کپڑے گیلے ہیں۔ اس طرح گیلا پڑا رہے گا تو کہیں اس کو بخار نہ ہوجائے۔ اس کی طبیعت خراب نہ ہوجائے۔ وہ بے چاری اپنے نفس کا تقاضہ چھوڑ کر سخت کڑاکے کے جاڑے میں باہر جاکر ٹھنڈے پانی سے اس کے کپڑے دھو رہی ہے، اور اس کے کپڑے بدل رہی ہے، یہ کوئی معمولی مشقت ہے؟ معمولی تکلیف ہے؟ لیکن ماں یہ تکلیف برداشت کر رہی ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اپنے بچے کی فلاح اور اس کی صحت ماں کے پیش نظر ہے، اس لئے وہ اس سخت جاڑے میں اپنے نفس کے تقاضے کو پامال کر کے یہ سارے کام کر رہی ہے۔

مُحبّت تکلیف کو ختم کردیتی ہے

ایک عورت کا کوئی بچہ نہیں ہے، کوئی اولاد نہیں ہے، وہ کہتی ہے بھائی! کسی طرح میرا علاج کراؤ تاکہ بچہ ہوجائے، اولاد ہوجائے، اور اس کے لئے دعائیں کراتی پھرتی ہے کہ دعا کرو اللہ میاں سے کہ مجھے اولاد دے دے، اور اس کے لئے تعویذ، گنڈے اور خدا جانے کیا کیا کراتی پھر رہی ہے، ایک دوسری عورت اس سے کہتی ہے کہ ارے! تو کس چکر میں پڑی ہے؟ بچہ پیدا ہوگا تو تجھے بہت سی مشقتیں اٹھانی پڑیں گی، جاڑے کی راتوں میں اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے کپڑے دھونے ہوں گے، تو وہ عورت جواب دیتی

ہے کہ میرے ایک بچے پر ہزار جاڑوں کی راتیں قربان ہیں اس لئے کہ اس بچے کی قدر وقیمت اور اس کے دولت ہونے کا احساس اس کے دل میں ہے، اس واسطے اس ماں کے لئے ساری تکلیفیں راحت بن گئیں، وہ ماں جو اللہ سے مانگ رہی ہے کہ یا اللہ! مجھے اولاد دے دے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اولاد کی جتنی ذمہ داریاں ہیں، جتنی تکلیفیں ہیں وہ دے دے، لیکن وہ تکلیفیں اس کی نظر میں تکلیفیں ہی نہیں، بلکہ وہ راحت ہیں۔ اب جو ماں جاڑے کی رات میں اٹھ کر کپڑے دھو رہی ہے اس کو طبعی طور پر تکلیف تو ضرور ہو رہی ہے لیکن عقلی طور پر اسے اطمینان ہے کہ میں یہ کام اپنے بچے کی بھلائی کی خاطر کر رہی ہوں، جب یہ اطمینان ہوتا ہے تو اس وقت اسے اپنی آرزوؤں کو کچلنے میں بھی لطف آنے لگتا ہے

اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح فرماتے ہیں:

از محبّت تلخہا شیریں شود

کہ جب مُحبّت پیدا ہو جاتی ہے تو کڑوی سے کڑوی چیزیں بھی میٹھی معلوم ہونے لگتی ہیں، جن کاموں میں تکلیف ہو رہی تھی مُحبّت کی خاطر ان میں بھی مزہ آنے لگتا ہے، لطف آنے لگتا ہے کہ میں یہ کام مُحبّت کی وجہ سے کر رہا ہوں، مُحبّت کی خاطر کر رہا ہوں۔

مولیٰ کی مُحبّت لیلیٰ سے کم نہ ہو

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں مُحبّت کی بڑی عجیب حکایتیں لکھی ہیں۔ لیلیٰ مجنون کا قصہ لکھا ہے کہ مجنون لیلیٰ کی خاطر کس طرح دیوانہ بنا، اور کیا کیا مشقتیں اٹھائیں، دودھ کی نہر نکالنے کے ارادہ سے چل کھڑا ہوا اور کام شروع بھی کر دیا، یہ ساری مشقتیں اٹھا رہا ہے، کوئی اس سے کہے کہ وہ یہ جو کام کر رہا ہے یہ بڑی مشقت کا کام ہے اسے چھوڑ دے، تو وہ کہتا ہے کہ ہزار مشقتیں قربان، جس کی خاطر یہ کام کر رہا ہوں اس کی مُحبّت میں کر رہا ہوں، مجھے تو اسی نہر کھودنے میں مزہ آ رہا ہے، اس لئے کہ یہ میں اپنی محبوب کی خاطر کر رہا ہوں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود
گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

مولیٰ کا عشق حقیقی کب لیلیٰ کے عشق سے کم ہو سکتا ہے۔ مولیٰ کے لئے گیند بن جانا زیادہ اولیٰ ہے۔ لہٰذا جب آدمی مُحبّت کی خاطر یہ تکلیفیں اٹھاتا ہے تو پھر بڑا لطف آنے لگتا ہے۔

تنخواہ سے مُحبّت ہے

ایک آدمی ملازمت کرتا ہے، جس کے لئے صبح سویرے اٹھنا پڑتا ہے، اچھی خاصی سردی میں بستر پر لیٹا ہوا ہے اور جانے کا وقت آگیا تو بستر چھوڑ کر جارہا ہے، نفس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ گرم گرم بستر میں پڑا رہتا لیکن گھر چھوڑ کر، بیوی بچوں کو چھوڑ کر جارہا ہے۔ اور سارا دن محنت کی چکی پیسنے کے بعد رات کو کسی وقت گھر واپس آتا ہے۔ اور بے شمار لوگ ایسے بھی ہیں جو صبح اپنے بچوں کو سوتا ہوا چھوڑ کر جاتے ہیں اور رات کو واپس آکر سوتا ہوا پاتے ہیں۔ غرض وہ شخص یہ سب تکلیفیں برداشت کررہا ہے، اب اگر کوئی شخص اس سے کہے کہ ارے بھائی! تم ملازمت میں بہت تکلیف اٹھارہے ہو، چلو میں تمہاری ملازمت چھڑادیتا ہوں۔ وہ جواب دے گا نہیں بھائی نہیں، بڑی مشکل سے تو یہ ملازمت لگی ہے اس کو مت چھڑوانا۔ اس کو صبح سویرے اٹھ کر جانے میں ہی مزہ آرہا ہے، اور اولاد کو، بیوی کو چھوڑ کر جانے میں بھی مزہ آرہا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اس کو اس تنخواہ سے مُحبّت ہوگئی ہے جو مہینے کے آخر میں ملنے والی ہے، اس مُحبّت کے نتیجے میں یہ ساری تکلیفیں شیریں بن گئیں، اب اگر کسی وقت ملازمت چھوٹ گئی تو روتا پھر رہا ہے کہ ہائے وہ دن کہاں گئے جب صبح سویرے اٹھ کر جایا کرتا تھا۔ اور لوگوں سے سفارشیں کراتا پھر رہا ہے کہ مجھے ملازمت پر دوبارہ بحال کردیا جائے۔ اگر مُحبّت کسی چیز سے ہوجائے تو اس راستے کی ساری تکلیفیں آسان اور مزے دار ہوجاتی ہیں، اسی میں لطف آنے لگتا ہے۔

اسی طرح گناہوں کو چھوڑنے میں تکلیف ضرور ہے، شروع میں مشقت ہوگی، لیکن جب ایک مرتبہ ڈٹ گئے اور اس کے مطابق عمل شروع کردیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد بھی ہوگی اور پھر انشاء اللہ تعالیٰ اس تکلیف میں مزہ آنے لگے گا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مزہ آنے لگے گا۔

عبادت کی لذّت سے آشنا کردو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئ صاحب قدس اللہ سرہ نے ایک مرتبہ بڑی عجیب وغریب بات ارشاد فرمائی، فرمایا کہ انسان کے اس نفس کو لذّت اور مزہ چاہئے، اس کی خوراک لذّت اور مزہ ہے لیکن لذت اور مزے کی کوئی خاص شکل اس کو مطلوب نہیں کہ فلاں قسم کا مزہ چاہئے اور فلاں قسم کا نہیں چاہئے، بس اس کو تو مزہ چاہئے۔ اب تم نے اس کو خراب قسم کے مزے کا عادی بنادیا ہے اور خراب قسم کی لذّتوں کا عادی بنادیا ہے، ایک مرتبہ اس کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کی لذّت سے آشنا کردو پھر یہ نفس اسی میں لذّت اور مزہ لینے لگے گا۔

حضرت سفیان ثوریؒ کا فرمان

حضرت سفیانِ ثوری رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے محدّثین اور اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کو محض اپنے فضل وکرم سے علم کی، عبادت کی اور اللہ کی یاد اور ذکر کی جو لذّت عطا فرمائی ہوئی ہے اگر اس لذّت کی اطلاع اور خبران بڑے بڑے بادشاہوں اور سرمایہ داروں کو ہوجائے تو وہ تلواریں سونت کر ہمارے پاس آجائیں کہ یہ لذّت ہمیں بھی دو۔ لیکن چونکہ ان کو پتا نہیں کہ ہم لوگ لذّت کے کس عالم میں ہیں، اور کس کیف میں زندگی گزار رہے ہیں، اس لذّت کی ہوا بھی ان کو نہیں لگی۔ اس لئے وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان گناہوں کے اندر بھی مزہ ہے۔ لیکن حقیقی لذّت اللہ تعالیٰ نے ہم کو عطا فرمائی ہے۔

مجھے تو دن رات بے خودی چاہئے

غالب کا ایک مشہور شعر ہے، خدا جانے لوگ اس کا کیا مطلب لیتے ہوں گے لیکن ہمارے حضرتؒ نے اس کا بڑا اچھا مطلب نکالا ہے وہ شعر ہے ۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

یعنی شراب سے مجھ کو کوئی تعلق نہیں، مجھے تو دن رات لذّت کی بے خودی چاہئے، تم نے مجھے شراب کا عادی بنادیا تو مجھے شراب میں بے خودی حاصل ہو گئی اور شراب میں لذّت آنے لگی، اگر تم مجھے اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے ذکر اور اس کی اطاعت کا عادی بنادیتے تو یہ بے خودی مجھے اللہ کے ذکر میں حاصل ہوجاتی، میں تو اسی میں خوش ہوجاتا، لیکن یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم نے مجھے ان چیزوں کے بجائے شراب کا عادی بنادیا۔

نفس کو کچلنے میں مزہ آئے گا

اسی طرح یہ مجاہدہ شروع میں تو بڑا مشکل لگتا ہے کہ بڑا کٹھن سبق دیا جارہا ہے کہ اپنے نفس کی مخالفت کرو، اپنے نفس کی خواہشات کی خلاف ورزی کرو۔ نفس تو چاہ رہا ہے کہ غیبت کروں۔ مجلس میں غیبت کرنے کا موضوع آگیا، اب جی چاہ رہا ہے کہ اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لوں، اب اس وقت اس کو لگام دینا کہ نہیں، یہ کام مت کرو، یہ بڑا مشکل کام لگتا ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ دور دور سے یہ مشکل نظر آتا ہے۔ جب آدمی نے یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ یہ کام نہیں کروں گا تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اور فضل وکرم سے مدد بھی ہوگی۔ اور پھر تم نے اس لذّت، آرزو اور خواہش کو جو کچلا ہے، اس کچلنے میں جو مزہ آئے گا انشاء اللہ ثم انشاء اللہ اس کی حلاوت اس غیبت کی لذّت سے کہیں زیادہ ہوگی۔

ایمان کی حلاوت حاصل کرلو

حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

ایک شخص کے دل میں تقاضہ پیدا ہوا کہ نگاہ غلط جگہ پر ڈالوں، اور کون شخص ہے جس کے دل میں یہ تقاضہ نہیں ہوتا، اب دل بڑا کسمسارہا ہے کہ اس کو دیکھ ہی لوں، لیکن آپ نے اللہ تعالیٰ کے ڈر اور خشیت کے خیال سے نظر کو بچالیا اور نگاہ نہیں ڈالی، تو اس میں بڑی تکلیف تو ہوئی، دل پر آرے چل گئے، لیکن اسی تکلیف کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ایمان کی ایسی حلاوت عطا فرمائیں گے کہ اس کے آگے دیکھنے کی لذت ہیچ ہے، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدہ ہے اور حدیث میں موجود ہے۔

(مسند احمد، جلد ۵ صفحہ ۲۶۴)

یہ وعدہ صرف نگاہ کے گناہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر گناہ چھوڑنے پر یہ وعدہ ہے، مثلاً غیبت میں بڑا مزہ آرہا ہے لیکن ایک مرتبہ آپ نے اللہ جل جلالہ کے خیال سے غیبت چھوڑ دی اور غیبت کرتے کرتے رک گئے۔ اللہ کے ڈر کے خیال سے غیبت کا کلمہ زبان پر آتے آتے رک گیا، پھر دیکھو کیسی لذت حاصل ہوتی ہے اور جب انسان گناہوں کی لذت کے مقابلے میں اس لذت کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے ساتھ تعلق پیدا ہوجاتا ہے۔

حاصل تصوف

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے کیا اچھی بات ارشاد فرمائی، یاد رکھنے کے لائق ہے، فرمایا: "وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جب دل میں کسی اطاعت کے کرنے میں سستی پیدا ہو، مثلاً نماز کا وقت ہوگیا لیکن نماز کو جانے میں سستی ہو رہی ہے تو اس سستی کا مقابلہ کرکے اس اطاعت کو کرے، اور جب گناہ سے بچنے میں دل سستی کرے تو اس سستی کا مقابلہ کرکے اس گناہ سے بچے" پھر فرمایا کہ: "بس اسی

سے تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے، اسی سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہوتی ہے، اور جس شخص کو یہ بات حاصل ہوجائے اس کو پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں" لہٰذا نفسانی خواہشات پر آرے چلا چلا کر اور ہتھوڑے مار مار کر جب اس کو کچل دیا تو اب وہ نفس کچلنے کے نتیجے میں اللہ جل جلالہ کی تجلی گاہ بن گیا۔

دل تو ہے ٹوٹنے کے لئے

ہمارے والد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک مثال دیا کرتے تھے۔ اب تو وہ زمانہ چلا گیا، پہلے زمانے میں یونانی حکیم ہوا کرتے تھے، وہ کشتہ بنایا کرتے تھے، سونے کا کشتہ، چاندی کا کشتہ، سنکھیا کا کشتہ اور نہ جانے کیا کیا کشتے تیار کرتے تھے اور کشتہ بنانے کے لئے وہ سونے کو جلاتے تھے اور اتنا جلاتے تھے کہ وہ سونا راکھ بن جاتا تھا اور کہتے تھے کہ سونے کو جتنا زیادہ جلایا جائے گا اتنا ہی اس کی طاقت میں اضافہ ہوگا۔ اب جلا جلا کر جب کشتہ تیار کیا تو وہ کشتہ طلاء تیار ہوگیا، کوئی اس کو ذرا سا کھالے تو پتہ نہیں کہاں کی قوت آجائے گی۔ تو جب سونے کو جلا جلا کر مٹا مٹا کر پامال کر کر کے راکھ بنادیا تو اب یہ کشتہ تیار ہوگیا۔ ہمارے حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ان خواہشاتِ نفس کو جب کچلو گے اور کچل کچل کر پیس پیس کر راکھ بنا کر فنا کردو گے تب یہ کشتہ بن جائے گا، اس میں اللہ جل جلالہ کے ساتھ تعلق کی قوت آجائے گی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت آجائے گی۔ اب دل اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ بن جائے گا، تو اس دل کو جتنا توڑو گے اتنا ہی یہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں محبوب بنے گا۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، کہ یہ آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

تم اس پر جتنی چوٹیں لگاؤ گے اتنا ہی یہ بنانے والے کی نگاہ میں محبوب ہوگا، بنانے والے نے اس کو اسی لئے بنایا ہے کہ اسے توڑا جائے، اس کی خاطر اس کی خواہشات کو کچلا جائے، اور جب وہ کچل جاتا ہے تو کیا سے کیا بن جاتا ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر

صاحب قدس اللہ سرہ کیا اچھا شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

یہ کہہ کے کاسہ ساز نے پیالہ پٹک دیا
اب اور کچھ بنائیں گے اس کو بگاڑ کے

اور کچھ بنائیں گے، یعنی وہ جو چاہیں گے وہ بنائیں گے۔ لہٰذا یہ نہ سمجھو کہ خواہشاتِ نفس کو کچلنے سے جو چوٹیں لگ رہی ہیں اور جو تکلیف ہو رہی ہے وہ بے کار جارہی ہیں بلکہ اس کے بعد جب یہ دل اللہ تعالیٰ کی محبّت کا محل بنے گا اور اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی یاد کا محل بنے گا تو اس وقت اس کو جو حلاوت نصیب ہوگی خدا کی قسم اس کے مقابلے میں گناہوں کی یہ ساری لذتیں خاک در خاک ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ دولت ہم سب کو نصیب فرمائیں اور ہماری فہم کو درست فرمائے۔ اور ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اپنی فکر کریں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۲۶ رمئی ۱۹۹۴ء

مقام خطاب : مسجد اقصیٰ جے ایریا
کورنگی۔کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اپنی فکر کریں

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيآت اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له ونشهدان سيدنا وسندنا ومولانا محمداً عبده ورسوله صلى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ آله وصحبه اجمعين ، وبارك وسلم تسليماً كثيرًا كثيراً—

اما بعد!

فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم،

بسم الله الرحمن الرحيم

﴿يا ايها الذين آمنوا عليكم انفسكم لا يضركم من ضلّ اذا اهتديتم، الى الله مرجعكم جميعًا

فینبئکم بما کنتم تعملون﴾ (سورۃ المائدۃ: ۱۰۵)
آمنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم و صدق رسولہ النبی الکریم ونحن علی ذلك من الشاھدین والشاکرین، والحمد للہ رب العالمین﴾

ایک آیت پر عمل

یہ قرآن کریم کی ایک مختصر سی آیت ہے۔ قرآن کریم کا یہ عجیب وغریب اعجاز ہے کہ اس کی کوئی آیت مختصر ہی کیوں نہ ہو۔ اگر انسان اس کو ٹھیک طرح سمجھ کر اس پر عمل کرلے تو اس کی زندگی کو درست کرنے کے لئے تنہا ایک آیت بھی کافی ہوجاتی ہے۔ یہ آیت بھی اسی قسم کی ہے' اس آیت میں ایک عجیب وغریب حقیقت کا بیان فرمایا گیا ہے اور پوری اُمّتِ مُسلمہ کو ایک عجیب ہدایت دی گئی ہے۔ اگر یہ ہدایت ہمارے دلوں میں اتر جائے اور ہم اس پر عمل پیرا ہونے کا عہد کرلیں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے ذریعہ ہمارے سارے مصائب و آلام کا خاتمہ ہوجائے۔

مسلمانوں کی بدحالی کا سبب

اس سے پہلے کہ اس آیت کا ترجمہ اور اس کا مطلب آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں' ایک اہم سوال کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں' جو اکثر وبیشتر ہم میں سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت پوری اُمّتِ مُسلمہ جہاں کہیں آباد ہے وہ مسائل کا شکار ہے۔ مصیبتوں اور پریشانیوں سے سابقہ ہے۔
کہیں بوسنیا کے مسلمانوں پر ظلم وستم ہورہا ہے۔ کہیں کشمیر میں مسلمان ظلم وستم

برداشت کررہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان کافروں اور ہندوؤں کے ظلم وستم کا شکار ہیں۔ صومالیہ میں مسلمان خانہ جنگی کا شکار ہیں۔ افغانستان میں مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ یہ سارے مسائل جو پوری اُمّتِ مُسلمہ کو درپیش ہیں۔ ان کے سبب پر جب غور کرنے کی نوبت آتی ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں ایمان کی ذرّہ برابر بھی رَمق ہے۔ وہ لوگ غور کرنے کے بعد یہ کہتے ہیں کہ ان مصائب و آلام کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم دین کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اللہ کی بندگی کرنی چھوڑ دی ہے۔ آپ کی سنّتوں کی اتباع کرنا چھوڑ دیا ہے اور بداعمالیوں میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں یہ آفتیں ہمارے اوپر آرہی ہیں۔ اور یہ بات بالکل درست ہے۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

﴿مَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ﴾ (سورة الشورىٰ: ۳۰)

یعنی جو کچھ مصیبت تمہیں پہنچتی ہے وہ سب تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور بہت سے تمہارے اعمال بد ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمادیتے ہیں۔ ان کی کوئی سزا تمہیں نہیں دیتے۔ لیکن بعض بداعمال ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی سزا اس دنیا کے اندر ان مصیبتوں کی شکل میں دی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب ہم آپس میں بیٹھ کر اُمّتِ مُسلمہ کے ان مصائب کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے اسباب کا جائزہ لیتے ہیں تو مشکل ہی سے شاید ہماری کوئی مجلس اس تذکرہ سے خالی جاتی ہوگی کہ ہم سب بداعمالیوں کا شکار ہیں۔ بدعنوانیوں کا شکار ہیں۔ گناہوں کے اندر مبتلا ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو چھوڑا ہوا ہے۔ یہ ساری مصیبتیں ان بداعمالیوں کا نتیجہ

ہیں۔

کوششیں رائیگاں کیوں؟

لیکن یہ سارا تذکرہ ہونے کے باوجود یہ نظر آتا ہے کہ پرنالہ وہیں گر رہا ہے اور حالات میں کوئی بہتری نظر نہیں آتی۔ بہت سی جماعتیں' انجمنیں اور ادارے اس مقصد کے تحت قائم ہیں کہ حالات کی اصلاح کریں۔ لیکن حالات جوں کے توں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے دینی کا جو سیلاب امڈ رہا ہے اس کی رفتار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس میں کمی نہیں آرہی ہے۔ کسی شاعر نے کہا تھا ؎

یہ کیسی منزل ہے کیسی راہیں
کہ تھک گئے پاؤں چلتے چلتے
مگر وہی فاصلہ ہے قائم
جو فاصلہ تھا سفر سے پہلے

یعنی جو فاصلہ سفر سے پہلے تھا وہ فاصلہ اب بھی قائم ہے' ہزاروں قربانیاں بھی دی جارہی ہیں۔ لوگ جانیں بھی دے رہے ہیں۔ انجمنیں' جماعتیں اور ادارے اصلاحِ حال میں لگے ہوئے ہیں۔ محنت ہو رہی ہے۔ لیکن عالمِ وجود کے اندر ان کا کوئی واضح فائدہ نظر نہیں آتا۔ ایسا کیوں ہے؟

اصلاح کا آغاز دوسروں سے

یہ آیت جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے اس میں اس سوال کا تسلّی بخش جواب عطا فرمایا ہے۔ قرآنِ کریم اس آیت میں ہمیں اس طرف توجہ دلا رہا ہے کہ جب تم حالات کی اصلاح کرنے کی فکر لے کر اٹھتے ہو تو تم ہمیشہ

اصلاح کا آغاز دوسروں سے کرنا چاہتے ہو۔ یعنی تمہارے دلوں میں یہ بات ہوتی ہے کہ لوگ خراب ہوگئے ہیں۔ لوگ بداعمالیوں میں مبتلا ہیں۔ لوگ دھوکہ' فریب کررہے ہیں۔ بدعنوانیوں میں مبتلا ہیں۔ رشوت لے رہے ہیں۔ سُود کھارہے ہیں۔ عُریانی اور فحاشی کا بازار گرم ہے۔ ان سب باتوں کے تذکرے کے وقت تمہارے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ یہ سب کام دوسرے لوگ کررہے ہیں۔ ان لوگوں کو ان کاموں سے روکنا ہے اور ان کی اصلاح کرنی ہے۔

اپنی اصلاح کی فکر نہیں

لیکن یہ خیال شاذونادر ہی کسی اللہ کے بندے کے دل میں آتا ہے کہ میں بھی کسی خرابی کے اندر مبتلا ہوں۔ میرے اندر بھی کچھ عیوب اور خرابیاں پائی جاتی ہیں اور ان خرابیوں کی اصلاح کرنا میرا سب سے پہلا فرض ہے۔ میں دوسروں کی طرف بعد میں دیکھوں گا پہلے میں اپنا جائزہ لوں اور اپنی اصلاح کی پہلے فکر کروں۔ آج ہمارا حال یہ ہے کہ جب اصلاح کے لئے کوئی جماعت' کوئی تنظیم یا ادارہ قائم ہوتا ہے تو اس ادارے کے چلانے والوں اور اس تنظیم کو قائم کرنے والوں میں سے ہر شخص کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ میں عوام کی اصلاح کروں۔ لیکن میں اپنی اصلاح کروں اور اپنے عیوب کو دور کروں۔ یہ خیال شاذونادر ہی کسی اللہ کے بندے کے دل میں آتا ہوگا۔

بات میں وزن نہیں

اس عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ جب میں اپنے عیوب سے بے خبر ہوں۔ اپنی خرابیوں کی اصلاح کی تو مجھے فکر نہیں ہے۔ میرے اپنے اعمال اللہ کی رضا کے مطابق نہیں ہیں۔ اور میں دوسروں کی اصلاح کی فکر میں لگا ہوا ہوں تو اس کا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میری بات میں نہ تو کوئی اثر اور وزن ہوتا ہے اور نہ اس کے اندر برکت اور نور ہوتا ہے کہ وہ بات دوسروں کے دلوں میں اتر جائے اور وہ اس کو ماننے پر آمادہ ہو جائیں۔ بلکہ وہ ایک لچھے دار تقریر ہوتی ہے جو کانوں سے ٹکرا کر ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

ہر شخص کو اپنے اعمال کا جواب دینا ہے

قرآن کریم کا ارشاد یہ ہے کہ اے ایمان والو! تم اپنی اصلاح کی فکر کرو۔ اگر تم نے اپنی اصلاح کرلی اور ہدایت کے راستے پر آگئے تو پھر جو لوگ گمراہی کی طرف جارہے ہیں اور گمراہیوں کا ارتکاب کررہے ہیں۔ ان کی بُرائی اور گمراہی تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔ اس لئے کہ تم سب کو اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ تم کو بتائے گا جو کچھ تم اس دنیا میں کیا کرتے تھے۔ اس آیت میں یہ بتادیا کہ ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کے پاس اپنے اعمال کا جواب دینا ہے' یہ نہیں ہوگا کہ بد عملی دوسرا شخص کرے اور جواب مجھ سے طلب کیا جائے کہ وہ شخص بد عملی کے اندر کیوں مبتلا تھا یا میں کوئی بُرا عمل کروں اور جواب دوسرے سے طلب کیا جائے۔ ایسا نہیں ہوگا بلکہ ہر شخص سے اس کے اپنے عمل کا سوال ہوگا۔ اس لئے تم پہلے اپنی فکر کرو کہ تمہارے اعمال کیسے ہیں؟ تم جب اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری دو گے تو تم اپنی زندگی کے اعمال کے بارے میں کیا جواب دو گے؟ اس لئے دوسروں کی فکر سے پہلے اپنی خبرلو۔ اور ہر شخص اپنے اعمال اور اخلاق کا جائزہ لے کر دیکھے کہ وہ کس گمراہی اور کس غلطی کے اندر مبتلا ہے۔ اور پھر ان غلطیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ یہ نہ ہو کہ دوسروں کے عیوب اور بُرائیوں کو تو تلاش کرتا پھرے۔ اور اپنے عیوب سے غافل ہو جائے۔

ایک حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

﴿مَنْ قَالَ : هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَكُهُمْ﴾

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب النهی عن قول هلك الناس)

جو شخص یہ کہے کہ سارے لوگ ہلاک اور برباد ہوگئے۔ اس لئے کہ ان کے اعمال خراب، ان کے عقائد خراب، ان کی عبادتیں خراب، اس کے نتیجے میں وہ لوگ تباہ وبرباد ہوگئے۔ تو سب سے زیادہ ہلاک ہونے والا شخص وہ خود ہے جو دوسروں کی بُرائیاں تو بیان کررہا ہے لیکن اپنی حالت سے بے خبر ہے۔ اگر اپنے اعمال اور اپنی اصلاح کی فکر میں لگ جائے اور دل میں یہ تڑپ لگ جائے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دوں گا؟ تو یقیناً اس صورت میں وہ شخص اپنے آپ کو سب سے بُرا محسوس کرے گا اور اس وقت دوسرے لوگ بُرے نظر نہیں آئیں گے۔

حضرت ذوالنّون مصری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ذوالنّون مصری رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ یہ اتنے بڑے بزرگ ہیں کہ ہم لوگ اس کا تصوّر بھی نہیں کرسکتے۔ ان کے بارے میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے شہر میں قحط پڑگیا۔ اور بارش بند ہوگئی۔ لوگ پریشان تھے۔ اور بارش کی دعائیں کررہے تھے۔ کچھ لوگ حضرت ذوالنّون مصری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت : آپ دیکھ رہے ہیں کہ پوری قوم قحط سالی کے اندر مبتلا ہے، زبانیں اور گلے تک خشک ہوگئے ہیں۔ جانوروں کو پلانے کے لئے پانی نہیں ہے۔ کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے پانی نہیں ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بارش عطا فرمائے۔ حضرت ذوالنّون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دعا تو میں کروں گا انشاء اللہ، لیکن ایک بات سن لو، وہ یہ کہ قرآنِ کریم کا ارشاد

ہے کہ جو کچھ تمہیں دنیا میں کوئی مصیبت یا پریشانی آتی ہے وہ لوگوں کی بداعمالیوں اور گناہوں کی وجہ سے آتی ہے۔ لہٰذا اگر بارش نہیں ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بداعمالیوں میں مبتلا ہیں اور ان بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہم سے بارش کو روک دیا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم میں سے کون سا شخص سب سے زیادہ بداعمالی میں مبتلا ہے۔ اور جب میں اپنا جائزہ لیتا ہوں تو یہ نظر آتا ہے کہ پوری بستی میں مجھ سے زیادہ خراب کوئی آدمی نہیں ہے۔ مجھ سے زیادہ گناہ گار کوئی نہیں ہے۔ میرا غالب گمان یہ ہے کہ بارش اس وجہ سے رُکی ہوئی ہے کہ میں اس بستی کے اندر مقیم ہوں۔ جب میں اس بستی سے نکل جاؤں گا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس بستی پر نازل ہو جائے گی۔ انشاء اللہ۔ اس لئے بارش ہونے کا علاج یہ ہے کہ میں اس بستی سے چلا جاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں عافیت کے ساتھ رکھے اور تم پر بارش نازل فرمائے۔

اپنے گناہوں کی طرف نظر تھی

دیکھئے : حضرت ذوالنّون مصری رحمۃ اللہ علیہ جیسا ولی اللہ، ولی کامل، اللہ کا نیک بندہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اس روئے زمین پر مجھ سے بڑا گناہ گار کوئی نہیں۔ اس لئے اگر میں اس بستی سے نکل جاؤں گا تو اللہ تعالیٰ اس بستی پر بارش نازل فرمادیں گے۔ اب بتائیے کہ کیا وہ جھوٹ بول رہے تھے؟ اور کیا وہ تواضعاً ایسا کہہ رہے تھے؟ حضرت ذوالنّون مصری رحمۃ اللہ علیہ جیسے ولی کامل کی زبان سے جھوٹ نہیں نکل سکتا بلکہ واقعتاً وہ اپنے آپ کو یہ سمجھتے تھے کہ سب سے زیادہ گناہ گار اور عیب دار میں ہوں۔ ایسا کیوں سمجھتے تھے؟ اس لئے کہ ہر وقت ان کی نگاہ اس پر تھی کہ میرے اندر کیا خرابیاں ہیں؟ اور ان کو کیسے دور کروں۔

نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس دور میں اللہ تعالیٰ نے عمل اور تقویٰ کا نمونہ بنایا تھا۔ ان کے ایک خلیفہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے ان سے ذکر کیا کہ جب آپ بیان فرماتے ہیں اور میں آپ کی مجلس میں ہوتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مجمع میں مجھ سے زیادہ تباہ حال شخص کوئی اور نہیں ہے۔ اور سب سے زیادہ گناہ گار میں ہوں۔ اور دوسرے لوگوں کے مقابلے میں' میں اپنے آپ کو جانور محسوس کرتا ہوں۔ جواب میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی تم یہ جو اپنی حالت بیان کررہے ہو سچ پوچھو تو میری بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ جب میں وعظ اور بیان کررہا ہوتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ سب لوگ مجھ سے اچھے ہیں۔ میں سب سے زیادہ خراب ہوں۔

ایسا کیوں تھا؟ اس لئے کہ ہر وقت ان کو یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ میرے اندر کون سا عیب ہے؟ کون سا گناہ ہے؟ میں اس کو کس طرح دور کروں؟ اور اللہ تعالیٰ کی رضا کیسے حاصل کروں؟ اگر انسان اپنے عیوب کا جائزہ لینا شروع کرے تو پھر دوسروں کے عیوب نظر نہیں آتے۔ اس وقت اپنی فکر میں انسان لگ جاتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر مرحوم نے کہا تھا کہ ؎

تھے جو اپنی بُرائی سے بے خبر
رہے اوروں کے ڈھونڈتے عیب وہنر
پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

یعنی جب تک دوسروں کو دیکھتے رہے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ فلاں کے اندر یہ

بُرائی ہے اور فلاں کے اندر یہ بُرائی ہے۔ لیکن جب اپنی بُرائیوں پر نظر کی تو معلوم ہوا کہ کوئی بھی اتنا بُرا نہیں ہے جتنا بُرا میں خود ہوں۔ اس لئے کہ جب اپنے اعمال کا جائزہ لینے کی توفیق ہوئی تو ساری گندگیاں اور بُرائیاں سامنے آگئیں۔

یاد رکھئے! کوئی انسان دوسرے کی بُرائی سے اتنا واقف نہیں ہوسکتا جتنا انسان اپنی برائی سے واقف ہوتا ہے۔ انسان اپنے بارے میں جانتا ہے کہ میں کیا سوچتا ہوں۔ اور میرے دل میں کیا خیالات پیدا ہوتے ہیں؟ کیسے کیسے ارادے میرے دل میں آتے ہیں؟ لیکن چونکہ اپنی طرف نظر نہیں، اپنے عیوب سے بے خبر ہے۔ اس لئے دوسروں کے عیوب اس کو نظر آتے ہیں۔ اس کو اپنی پرواہ نہیں ہوتی۔

اپنی بیماری کی فکر کیسی ہوتی ہے

مثلاً ایک شخص کے پیٹ میں شدید درد ہے اور اس درد کی وجہ سے بے چین ہے، کسی کروٹ قرار نہیں آرہا ہے۔ بتایئے! کیا وہ شخص دوسروں کو دیکھتا پھرے گا کہ کس شخص کو نزلہ ہورہا ہے۔ کس کو کھانسی ہے، کس کو زکام ہے؟ بلکہ وہ شخص اپنے درد کو لے کر بیٹھ جائے گا، دوسروں کی بیماریوں کی پرواہ بھی نہیں کرے گا۔ بلکہ اگر کوئی شخص اس سے یہ کہے گا کہ مجھے نزلہ اور کھانسی ہورہی ہے تو جواب میں کہے گا کہ تمہارا نزلہ کھانسی اپنی جگہ، لیکن میں تو اپنے پیٹ کے درد میں مبتلا ہوں میں اپنے درد کا پہلے علاج کروں یا تمہارے نزلہ کھانسی کو دیکھوں۔ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہوگا جو اپنے درد سے بے چین ہونے کی حالت میں دوسروں کی معمولی بیماریوں کو دیکھتا پھرے۔

ایک خاتون کا نصیحت آموز واقعہ

میری عزیزوں میں ایک خاتون تھیں، ایک مرتبہ ان کے پیٹ میں ریاحی تکلیف ہوگئی اور اس کی وجہ سے وہ بے چین ہوگئیں اور نفسیاتی طور پر ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ میں بہت زیادہ بیمار ہوں۔ میں ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے ان کو ایک ہسپتال لے گیا۔ جب لفٹ کے ذریعہ اوپر جانے لگے تو وہاں ایک اور خاتون وہیل چیئر کے اوپر بیٹھی تھیں۔ اور اس کا سارا جسم آگ سے جلا ہوا تھا۔ اور بعض جگہ کی ہڈیاں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کھال جلی ہوئی تھی۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں اپنی عزیزہ خاتون سے کہوں کہ یہ تم سے زیادہ اور سخت تکلیف کے اندر مبتلا ہے تاکہ ان کو اپنی بیماری کا احساس کم ہوجائے۔ چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ دیکھو، یہ خاتون کتنی مصیبت میں ہے اور کتنی سخت تکلیف کے اندر مبتلا ہے۔ میری عزیزہ نے ان خاتون پر ایک اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے کہا کہ ہاں یہ تکلیف کے اندر مبتلا تو ہے۔ لیکن اس کے پیٹ میں تو درد نہیں ہو رہا ہے۔ دیکھئے! جس کا سارا جسم جلا ہوا ہے اور ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے، اس کی بیماری کا اتنا احساس نہیں جتنا اپنی بیماری کا احساس ہے۔

اس واقعہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ کاش دین کے معاملے میں ہمارے دلوں میں ایسی فکر پیدا ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ دین کی بیماریوں اور باطن کی بیماریوں میں یہ فکر پیدا کردے کہ میرے اندر جو بیماری ہے مجھے اس کی فکر لگ جائے اور اس کے نتیجے میں دوسروں کی بیماریوں پر نظر جانے کے بجائے میں اپنی بیماریوں کی اصلاح کی فکر کروں۔

حضرت حنظلہؓ کو اپنے نفاق کا شبہ

ایک مرتبہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں پہنچے۔ اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں تباہ و برباد ہوگیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ میں منافق ہوگیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیسے منافق ہوگئے؟ جواب میں فرمایا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب میں آپ کی مجلس میں بیٹھتا ہوں تو دل میں نیک جذبات اور نیک خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ کی یاد دل میں تازہ ہوتی ہے۔ اپنی اصلاح کی فکر ہوتی ہے۔ آخرت کی نعمتیں یاد آتی ہیں۔ لیکن جب کاروبارِ زندگی میں جاتا ہوں اور بیوی بچوں کے پاس جاتا ہوں تو وہ کیفیت باقی نہیں رہتی۔ اللہ کی طرف دھیان' اپنی اصلاح کی فکر اور آخرت اور جنت کا خیال باقی نہیں رہتا۔ اور یہ تو منافقت کی بات ہے کہ ظاہر میں تو مسلمان ہیں اور دل کے اندر بُرے بُرے خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس لئے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں تو منافق ہوگیا۔ اب آپ مجھے بتایئے کہ کس طرح اس منافقت سے نکلوں؟

دیکھئے : حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی یہ بات کہہ رہے ہیں اور صحابہ کے بارے میں پوری اُمّت کا اس پر اتفاق ہے کہ الصحابة کلّهم عدول تمام صحابہ عادل ہیں۔ ان میں کوئی فاسق نہیں ہو سکتا۔ ان کو یہ شبہ پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں میں منافق تو نہیں ہوگیا؟ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ گھر میں جاکر تمہیں جو خیالات بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور کیفیت بدلی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس سے پریشان نہ ہو۔ اس لئے کہ اس سے آدمی منافق نہیں ہوتا' یہ تو وقت وقت کی بات ہے۔ کسی وقت انسان کے دل پر اللہ کی یاد زیادہ ہوجاتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے رقت زیادہ ہوجاتی ہے' اور کسی وقت میں اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان کیفیات کے بدلنے سے آدمی منافق نہیں ہوتا۔

(صحیح مسلم۔ کتاب التوبہ' باب فضل دوام الذکر)

ان صحابی کو فکر اس بات کی نہیں تھی کہ فلاں شخص منافق ہوگیا۔ بلکہ اس بات کی فکر تھی کہ میں منافق ہوگیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نفاق کا شبہ

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ جو مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ تھے۔ جن کے بارے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

﴿لو کان بعدی نبیاً لکان عمر﴾

"اگر میرے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو وہ عمر ہوتے، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں"۔

اتنا اونچا مقام اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔ ان کا حال سنئے: سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی تھے۔ جن کا نام تھا حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار مشہور تھے۔ اس لئے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ منوّرہ میں رہنے والے منافقین کے نام بتادیئے تھے کہ فلاں فلاں شخص منافق ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے بتادیا تھا کہ مدینہ منورہ میں فلاں فلاں شخص منافق ہے۔ آپؐ نے اپنی حکمت کے تحت وہ نام حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور کو نہیں بتائے تھے۔ حتیٰ کہ جب کسی شخص کا انتقال ہوجاتا تو لوگ یہ دیکھا کرتے تھے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اس شخص کی نماز جنازہ میں شریک ہیں یا نہیں؟ اس لئے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا شریک ہونا اس بات کی علامت تھی کہ اس کا نام منافقین میں شامل نہیں۔ اور اگر شریک نہ ہوتے تو پتہ چل جاتا کہ اس کا نام منافقین میں شامل ہے۔ اس

لئے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ شریک نہیں ہوئے۔ تو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے ہیں، اور ان سے التجا کر کے پوچھتے ہیں کہ اے حذیفہؓ! خدا کے لئے مجھے یہ بتا دیں کہ تمہارے پاس منافقین کی جو فہرست ہے۔ اس میں "عمر" کا نام تو نہیں ہے؟ وہ شخص یہ بات پوچھ رہے ہیں جنہوں نے اپنے کانوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سن لیا ہے کہ "عمر فی الجنۃ" عمر جنت میں جائے گا۔ اور جن کے بارے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔ ان کو یہ فکر دامن گیر ہے کہ کہیں میں منافق تو نہیں ہوں۔ یہ فکر اس لئے تھی کہ بے شک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا کہ "عمر جنت میں جائے گا" لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی تو فرمادیا ہے کہ جو شخص بھی کلمہ "لا الہ الا اللہ" پڑھ لے گا وہ جنت میں جائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ خیال ہوا کہ کلمہ پڑھنے والا بے شک جنت میں جائے گا لیکن اگر مرنے سے پہلے کسی کے اعمال خراب ہوگئے تو پھر وہ شخص اس بشارت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں میرے اعمال خراب ہوگئے ہوں۔ اور میں منافقین میں داخل ہو گیا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان اپنے عیوب کا جائزہ لیتا ہے اور جب اس کو اپنی فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ میری اصلاح کیسے ہو؟ تو اس کے بعد اس کو دوسرے لوگ اتنے بُرے نظر نہیں آتے جتنا وہ اپنے آپ کو بُرا نظر آتا ہے۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۵ صفحہ ۱۹)

دین سے ناواقفیت کی انتہاء

آج ہمارا معاملہ الٹا ہو گیا ہے۔ آج اگر ہم دین کی کوئی بات کرتے ہیں تو اس میں عموماً اصلاح والی باتیں مفقود ہوتی ہیں۔ بلکہ عموماً ان باتوں میں یا تو فرقہ

واریت کے اندر مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کبھی سیاست پر گفتگو چھیڑ دی جاتی ہے یا کبھی ایسے نظریاتی مسائل پر گفتگو شروع ہو جاتی ہے جن کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں دین سے ناواقفیت اتنی عام ہو گئی ہے کہ پہلے دین کی جو باتیں چھوٹے بچوں کو معلوم ہوتی تھیں آج بڑے بڑے پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ افراد کو معلوم نہیں ہیں۔ اور اگر ان کو بتایا جائے کہ یہ دین کی بات ہے تو اجنبیت اور حیرت سے پوچھتے ہیں کہ اچھا یہ بھی دین کی بات ہے۔ ہمیں تو معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ بھی دین کا حصّہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ آج ہمارے اندر سے اپنی اصلاح کی فکر ختم ہو گئی ہے۔ قرآنِ کریم صاف صاف یہ کہہ رہا ہے کہ جب تک تم میں سے ہر شخص اپنی اصلاح کی فکر اپنے دل میں پیدا نہیں کرے گا، یاد رکھو : معاشرے کی اصلاح کبھی نہیں ہوگی۔ چاہے اصلاح کی جتنی انجمنیں بنالو، جتنے ادارے قائم کرلو۔

ہمارا یہ حال ہے

مثلاً اب اگر میں جھنڈے لگا کر اور بینر لگا کر اصلاح معاشرہ کے نعرے لگاتا پھرتا ہوں لیکن خود میرا یہ حال ہے کہ جب رشوت لینے کا موقع آتا ہے تو کسی سے پیچھے نہیں رہتا۔ اور جب دوسرے کو دھوکہ دے کر اس سے پیسے بٹورنے کا موقع مل جائے تو اس سے نہیں چوکتا۔ اور سُودی نظام کے خلاف نعرے لگانے میں پیش پیش ہوں لیکن جب سُودی معاملہ کرنے کا وقت آتا ہے تو خاموشی سے وہ معاملہ کرلیتا ہوں۔ بتایئے : پھر معاشرے کی اصلاح کہاں سے ہو؟ ساری دنیا کو بُرا بھلا کہتا ہوں کہ آج لوگ جھوٹے ہو گئے ہیں، مکر و فریب پھیل گیا ہے۔ دھوکہ بازی ہو گئی ہے۔ فسق و فجور کا بازار گرم ہے۔ لیکن جب جھوٹ بولنے کا موقع آجاتا ہے یا چھٹی بڑھانے کے لئے جھوٹا اور جعلی میڈیکل سرٹیفکیٹ بنانے کا موقع آجاتا ہے تو کیا کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ لے

رہا ہوں۔ یہ جھوٹ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی بات ہے۔ بتایئے! جب یہ سارے بُرے کام نہیں چھوڑتا تو پھر میرے اصلاحِ معاشرے کے نعرے لگانے سے، جلسے کرنے سے اور جلوس نکالنے سے کیا حاصل ہے؟ اسی طرح اگر میں دوسروں کو تو یہ طعنے دیتا ہوں کہ وہ دین سے دور چلے گئے ہیں اور دین کے احکام پر عمل پیرا نہیں ہیں۔ لیکن میری کوئی مجلس غیبت سے خالی نہیں ہوتی۔ کبھی اس کی بُرائی کرتا ہوں، کبھی اس کی بُرائی کرتا ہوں۔ اور اس طرح قرآنِ کریم کے بتانے کے مطابق ہر وقت، ہر روز اپنے مردار بھائی کا گوشت کھاتا ہوں۔ بتایئے! پھر معاشرے کی اصلاح کہاں سے ہو؟

اصلاح کا یہ طریقہ ہے

معاشرے کی اصلاح تو اس وقت ہوگی جب یہ سوچوں گا کہ میں جھوٹ بولتا ہوں تو کس طرح میں جھوٹ بولنا چھوڑ دوں؟ میں دوسروں کی غیبت کرتا ہوں تو اس غیبت کو چھوڑ دوں۔ میں دھوکہ بازی کرتا ہوں تو اس کو چھوڑ دوں۔ اگر میں رشوت لیتا ہوں تو رشوت لینا چھوڑ دوں۔ اگر سُود کھاتا ہوں تو اس کو چھوڑ دوں۔ اگر میں بے پردگی اور عُریانی وفحاشی میں مبتلا ہوں تو اس کو ترک کردوں۔ جب تک میرے اندر یہ فکر پیدا نہیں ہوگی، یاد رکھیں : اس وقت تک میں اصلاح کی یہ فکر دوسرے کے اندر منتقل نہیں کرسکتا۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے فرمادیا کہ :

﴿عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾

اپنی جانوں کی فکر کرو، اگر دوسرے لوگ گمراہ ہورہے ہیں تو ان کی گمراہی تمہیں نقصان نہیں پہنچاسکتی۔ بشرطیکہ تم راہِ راست پر ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے تربیت کی؟

دیکھئے : حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے۔ نبوت کے بعد ۲۳ر سال اس دنیا میں قیام فرمایا۔ ایسے وقت میں تشریف لائے جس وقت پورا جزیرہ عرب گمراہی اور جہالت کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ امید کی کوئی کرن نہیں نظر آرہی تھی۔ ہدایت کی کوئی روشنی موجود نہیں تھی۔ ایسے وقت میں آپ تنِ تنہا تشریف لائے' اور آپ کو حکم یہ دیا گیا کہ اس پورے معاشرے کو بدلنا ہے۔ اس کے اندر انقلاب لانا ہے۔ لیکن ۲۳ سال کے بعد جب اس دنیا سے واپس تشریف لے جاتے ہیں تو اس وقت جزیرہ عرب سے کفر اور شرک کا نام مٹ چکا تھا۔ اور وہی قوم جو ضلالت اور گمراہی اور جہالت کے اندر ڈوبی ہوئی تھی' ۲۳ سال کے بعد وہ قوم پوری دنیا کے لئے ایک مثال اور نمونہ بن کر ابھرتی ہے۔ یہ انقلاب کیسے آیا؟

ان ۲۳ سال میں سے تیرہ سال مکہ مکرمہ میں گزرے' ان ۱۳ سال میں نہ جہاد کا حکم ہے۔ نہ کوئی ریاست اور حکومت ہے اور نہ کوئی قانون ہے۔ بلکہ اس وقت حکم یہ ہے کہ اگر تمہیں کوئی مارے تو اس کا بدلہ بھی مت لو' بلکہ مار کھالو۔ "وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلاَّ بِاللّٰهِ" ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں' حالانکہ اگر دوسرا شخص دس ہاتھ مار سکتا تھا تو ایک ہاتھ یہ بھی مار سکتے تھے۔ لیکن حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو تپتی ہوئی ریت پر لٹایا جارہا ہے۔ اور سینے پر پتھر کی سلیں رکھی جارہی ہیں۔ اور یہ مطالبہ کیا جارہا ہے کہ کلمہ "لا الہ الا اللہ" کا انکار کرو۔ جس وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر یہ ظلم کیا جارہا تھا تو اس کے جواب میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ ایک تھپڑ تو مار سکتے تھے۔ لیکن اس وقت حکم یہ تھا کہ مار کھائے جاؤ' تمہیں تلوار اٹھانے کی یا ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں۔

صحابہ کرامؓ کُندن بن گئے

یہ سب کیوں تھا؟ اس لئے کہ ان کو آزمائش کی اس بھٹی سے گزار کر کُندن بنانا مقصود تھا کہ مار کھائیں اور اس پر صبر کریں۔ کون انسان ایسا ہے جس کو دوسرا انسان مارے اور اس کو غصّہ نہ آئے۔ لیکن حکم یہ دیا جارہا ہے کہ اس غصے کو دباؤ۔ اس لئے کہ جب اس غصّے کو اللہ کے لئے دباؤ گے تو اپنے نفسانی خواہشات کو اللہ کے حکم کے آگے قربان کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ لہٰذا مکی زندگی کے تیرہ سال اس طرح گزرے کہ اس میں حکم یہ تھا کہ دوسرے سے بدلہ لینے کے لئے ہاتھ مت اٹھاؤ بلکہ عبادت میں لگے رہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو' اللہ کو یاد کرو' آخرت کا تصور کرو۔ جنت اور دوزخ کا تصور کرو اور اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح کرو۔ جب تیرہ سال کے عرصے میں صحابہ کرامؓ کی جماعت اس صبر اور آزمائش سے گزر کر کندن بن کر تیار ہوگئی تو اس کے بعد مدینہ طیبہ کی زندگی کا آغاز ہوا۔ پھر آپ نے وہاں ایسی حکومت اور ایسا نظام قائم فرمایا کہ چشمِ فلک نے ایسا نظام نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ اب کے بعد کبھی دیکھا۔ اس لئے کہ ہر شخص اپنی اصلاح کی فکر سے سرشار ہوکر اپنے آپ کو کندن بنا چکا تھا۔ لہٰذا پہلا کام یہ ہے کہ اپنی اصلاح کی فکر کرو۔ اپنی اصلاح کے بعد جب انسان آگے دوسروں کی اصلاح کی طرف قدم بڑھائے گا تو انشاء اللہ اس میں کامیاب ہوگا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جس جگہ پر بھی پہنچے۔ فتح اور نصرت کو اللہ تعالیٰ نے ان کا مقدر بنادیا۔ اس لئے کہ اپنی اصلاح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کرا چکے تھے۔

آج ایسا لگتا ہے کہ اصلاح کی کوششیں بحیثیت مجموعی ناکام ہورہی ہیں۔ اور معاشرے پر ان کا کوئی نمایاں اثر نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ اپنی اصلاح کی فکر سے غافل ہوگئے ہیں۔ آج ہمارے اندر سے یہ فکر ختم

ہوگئی کہ مجھے اللہ کے سامنے حاضر ہو کر جواب دینا ہے اور میرے اندر کیا کیا خرابیاں ہیں میں ان کو کس طرح دور کروں؟

اپنا جائزہ لیں

میری آج کی گزارش کا حاصل یہ ہے کہ ہر شخص روزانہ یہ جائزہ لے کر صبح سے لے کہ شام تک کی زندگی میں کس جگہ پر میں اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کررہا ہوں۔ اسلام پانچ قسم کے اعمال کا مجموعہ ہے۔

(۱) عقائد درست ہونے چاہئیں۔

(۲) عبادات یعنی نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ وغیرہ درست ہونے چاہئیں۔

(۳) معاملات یعنی خرید و فروخت حلال طریقے سے ہو۔ آمدنی حلال ہو۔ کوئی آمدنی حرام کی نہ ہو۔

(۴) معاشرت یعنی آپس میں رہنے سہنے کے آداب میں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت اور ان کی پابندی کرے۔

(۵) اخلاق یعنی انسان کے اخلاق درست ہوں۔ بُرے اخلاق مثلاً بغض' تکبر' حسد' عناد وغیرہ انسان کے اندر نہ ہوں۔ اور اچھے اخلاق ہوں۔ مثلاً تواضع ہو۔ توکل ہو۔ شکر اور صبر ہو۔

ان پانچ شعبوں پر انسان عمل کرے تب انسان کا دین کامل ہوتا ہے۔ تب وہ شخص صحیح معنی میں مسلمان بنتا ہے۔ ہر شخص ان پانچ شعبوں کو سامنے رکھ کر اپنا جائزہ لے۔ مثلاً میرے عقائد درست ہیں یا نہیں؟ میرے ذمّے پانچ وقت کی نماز باجماعت فرض ہے۔ میں ان میں سے کتنی ادا کرلیتا ہوں اور کتنی نمازیں چھوڑتا ہوں؟ میری آمدنی حلال ہورہی ہے یا حرام ہورہی ہے؟ بازار میں جب میں معاملات کرتا ہوں تو وہ معاملات درست ہوتے ہیں یا نہیں؟ میرے اخلاق درست ہیں یا نہیں؟ دوسروں کے ساتھ میرا برتاؤ درست ہے یا نہیں؟ میں

جھوٹ تو نہیں بولتا۔ میں غیبت تو نہیں کرتا۔ میں کسی کا دل تو نہیں دکھاتا۔ میں کسی کو پریشان تو نہیں کرتا۔ اپنے اندر ان باتوں کا جائزہ لے۔ اور اگر کہیں کوئی بُرائی ہے تو اس کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ اگر بالکل نہیں چھوڑ سکتا تو اس کو کم کرنے کی کوشش کرے۔

مثلاً یہ دیکھے کہ میں دن میں کتنی مرتبہ جھوٹ بولتا ہوں۔ پھر دیکھے کہ ان میں سے کتنی مرتبہ جھوٹ بولنے کو میں فوراً چھوڑ سکتا ہوں ان کو فوراً چھوڑ دے۔ مجلس کے اندر کتنی مرتبہ میں غیبت کرتا ہوں۔ اس کو کس حد تک چھوڑ سکتا ہوں اس کو چھوڑ دے۔ اس طرح جائزہ لے کر گناہوں کو چھوڑنا شروع کردے اور اپنی اصلاح کی فکر پیدا کرلے۔ اگر ایک مرتبہ اصلاح کی فکر کی شمع تمہارے دل میں روشن ہوگئی تو انشاء اللہ یہ شمع تمہاری زندگی کو منوّر کردے گی۔ یہ مت سوچو کہ اگر ایک آدمی درست ہوگیا تو اس سے کیا اثر پڑے گا۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے

یاد رکھیئے : "معاشرہ" میرا اور تمہارا اور افراد کا نام ہے۔ اگر ایک آدمی کی اصلاح ہوگئی اور اس نے کچھ گناہ چھوڑ دیئے اور اللہ کے احکام کی اطاعت شروع کردی تو کم از کم ایک چراغ تو جل گیا۔ چراغ چاہے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو وہ اپنے ماحول کے اندر اندھیرے کو نہیں رہنے دیتا۔ بلکہ اپنے ماحول کو ضرور روشن کردے گا۔ کیا بعید ہے کہ ایک جلتے ہوئے چراغ کو دیکھ کر دوسرا شخص اس سے اپنا چراغ جلالے' دوسرے سے تیسرا چراغ جل جائے اور اس طرح پورا ماحول روشن اور منوّر ہوجائے۔ لیکن اگر آدمی یہ سوچتا رہے کہ میں اپنے چراغ کو تو ٹھنڈا رکھوں اور اس ٹھنڈے چراغ سے دوسرے لوگوں کے چراغ جلاؤں اور ان کو روشن کروں۔ یاد رکھیئے ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ جو چراغ خود بجھا ہوا ہو وہ دوسرے چراغ روشن نہیں کرسکتا۔ بالکل اسی طرح

اگر میں اپنی اصلاح کی فکر کئے بغیر دوسروں کی اصلاح کرنا شروع کردوں تو یہ ایسا ہے جیسے میں اپنے ٹھنڈے چراغ سے دوسروں کے چراغ روشن کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔ اور ایسا ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنی اصلاح کی فکر ہمارے دلوں میں پیدا فرمادے۔ آمین۔

یہ فکر کیسے پیدا ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ اپنی اصلاح کی فکر کیسے پیدا ہو؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح اس وقت یہاں بیٹھ کر اپنی اصلاح کی فکر کی باتیں ہم نے کیں اور سنیں تو اس کے نتیجے میں ہمارے دلوں میں اصلاح کی فکر کی تھوڑی بہت حرکت پیدا ہوئی۔ اب یہی تذکرہ بار بار سنا جائے اور مختلف مجلسوں میں سنا جائے تو بار بار سننے کے نتیجے میں یہ فکر انشاء اللہ ہمارے دلوں میں پیدا ہو جائے گی۔ دیکھئے: قرآنِ کریم میں "وَاَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ" (یعنی نماز قائم کرو) کے الفاظ باسٹھ مرتبہ آئے ہیں۔ حالانکہ اگر اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ بھی یہ حکم دے دیتے کہ نماز قائم کرو تو وہ بھی کافی تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بار بار دہرایا۔ کیوں؟ اس لئے کہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ جب کوئی بات بار بار کہی جاتی ہے تو اس کا اثر دل پر ہوتا ہے۔ وہ بات دل میں بیٹھ جاتی ہے، صرف ایک مرتبہ سننے سے فائدہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس فکر کو پیدا کرنے کے لئے ایسی مجلسوں میں جانے کا اہتمام کریں جہاں اصلاح کا تذکرہ ہوتا ہو۔

دارالعلوم میں ہونے والی اصلاحی مجالس

آپ کے قریب دارالعلوم کراچی موجود ہے۔ جہاں ہفتہ وار تین مجلسیں ہوتی ہیں۔ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم جو دارالعلوم کے صدر

ہیں۔ ان کا بیان بدھ کے روز عصر سے مغرب تک ہوتا ہے۔ جس میں مردوں کے لئے بھی انتظام ہوتا ہے اور خواتین کے لئے بھی۔ حضرت مولانا سبحان محمود صاحب مدّظلہم جو دارالعلوم کراچی کے شیخ الحدیث ہیں۔ ہمارے استاد اور بزرگ ہیں۔ ان کا بیان ہر اتوار کو عصر اور مغرب کے درمیان ہوتا ہے۔ حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب مدظلہم جو دارالعلوم کے استاد ہیں اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز ہیں۔ ان کا بیان ہر منگل کو عصر سے مغرب تک ہوتا ہے۔ اس طرح ہر ہفتے میں تین مجلسیں دارالعلوم میں ہوتی ہیں۔ ان مجلسوں کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان کے ذریعہ اپنی اصلاح کی فکر پیدا کی جائے۔

دیکھئے : جلسے اور تقریریں تو بہت ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ان مجلسوں کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے اندر اپنے آپ کو درست کرنے کی اور اصلاح کرنے کی فکر پیدا ہو۔ اگر ہفتے میں آپ عصر سے مغرب تک کا ایک گھنٹہ اس مقصد کے لئے فارغ کرلیں اور ان مجالس میں سے کسی ایک مجلس میں بھی شرکت فرمالیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دل میں اپنی اصلاح کی فکر پیدا ہوگی اور یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ غلطیاں اور کوتاہیاں کہاں کہاں ہو رہی ہیں۔ اس لئے کہ ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ غلطیاں کہاں کہاں ہو رہی ہیں۔ اور پھر ان غلطیوں کی اصلاح کرنے کا طریقہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ اللہ تعالی مجھے بھی اور آپ کو بھی عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ہم سب کو اپنی اصلاح کی فکر عطا فرمائیں۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

گناہگاروں سے نفرت مت کیجئے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۶ ستمبر ۱۹۹۶ء

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گناہ گار کو ذلیل نہ سمجھیں

الحمد للّٰہ نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ با للّٰہ من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده اللّٰہ فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له. ونشهد ان لاإله إلا اللّٰہ وحده لاشريك له ـ واشهد ان سيدنا ونبينا ومولانا محمداً عبده ورسوله، صلى اللّٰہ تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلّم تسليمًا كثيرًا كثيرًا۔ اما بعد :-

قال رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلّم : من عيّر أخاه بذنب قد تاب منه لم يمت حتى يعمله ـ

(ترمذی ـ کتاب صفة القيامة، باب مبر ٥٤)

کسی کو گناہ پر عار دلانے کا وبال۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو ایسے گناہ پر عار دلائے اور اس گناہ کا طعنہ دے جس گناہ سے وہ توبہ کر چکا ہے تو یہ طعنہ دینے والا شخص اس وقت تک نہیں مریگا جب تک وہ خود اس گناہ کے اندر مبتلا نہیں ہو جائیگا۔ مثلاً ایک شخص کے بارے میں آپ کو پتہ چل گیا کہ یہ فلاں گناہ کے اندر مبتلا تھا یا مبتلا ہوا ہے، اور آپ کو یہ بھی پتہ ہے کہ اس نے توبہ بھی کرلی ہے تو جس گناہ سے وہ توبہ کر چکا ہے اس گناہ کی وجہ سے اسکو حقیر سمجھنا یا اسکو عار دلانا یا اسکو طعنہ دینا کہ تم تو فلاں شخص ہو اور فلاں حرکت کیا کرتے تھے، ایسا طعنہ دینا خود گناہ کی بات ہے، اسلئے کہ جب اس شخص نے توبہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے اپنا معاملہ صاف کرلیا اور توبہ کرنے سے گناہ صرف معاف نہیں ہوتا بلکہ نامۂ اعمال سے وہ عمل مٹا دیا جاتا ہے تو اب اللہ تعالیٰ نے تو اس کا گناہ نامۂ اعمال سے مٹا دیا لیکن تم اس کو اس گناہ کی وجہ سے حقیر اور ذلیل سمجھ رہے ہو یا اسکو طعنہ دے رہے ہو اور اسکو برا بھلا کہہ رہے ہو، یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بہت سخت ناگوار ہے۔

گناہ گار ایک بیمار کی طرح ہے۔

یہ تو اس شخص کے بارے میں ہے جس کے بارے میں آپ کو معلوم ہے کہ اس نے گناہ سے توبہ کرلی ہے، اور اگر پتہ نہیں ہے کہ اس نے توبہ کی ہے یا نہیں، لیکن ایک مؤمن کے بارے میں احتمال تو ہے کہ اس نے توبہ کرلی ہو گی یا آئندہ کرلیگا، اسلئے اگر کسی نے گناہ کرلیا اور آپ کو توبہ کرنے کا علم بھی نہیں ہے، تب بھی اس کو حقیر سمجھنے کا کوئی حق

نہیں ہے' کیا پتہ کہ اس نے توبہ کر لی ہو۔ یاد رکھیے، نفرت گناہ سے ہونی چاہئے' گناہ گار سے نہیں' نفرت معصیت اور نافرمانی سے ہے' لیکن جس شخص نے معصیت اور نافرمانی کی ہے اس سے نفرت کرنا حضور اقدس ﷺ نے نہیں سکھایا۔ بلکہ وہ گناہ گار ترس کھانے اور رحم کے قابل ہے کہ وہ بیچارہ ایک بیماری کے اندر مبتلا ہے' جیسے کوئی شخص کسی جسمانی بیماری کے اندر مبتلا ہو تو اب اس شخص کی بیماری سے تو نفرت ہو گی' لیکن کیا اس بیمار سے نفرت کرو گے کہ چونکہ یہ شخص بیمار ہے اسلئے نفرت کے قابل ہے؟ ظاہر ہے کہ بیمار کی ذات قابل نفرت نہیں ہے' بلکہ اسکی بیماری سے نفرت کرو۔ اسکو دور کرنے کی فکر کرو' اس کے لئے دعا کرو' لیکن بیمار نفرت کے لائق نہیں' وہ تو ترس کھانے کے لائق ہے کہ یہ بیچارہ اللہ کا بندہ کس مصیبت کے اندر مبتلا ہو گیا۔

کفر قابل نفرت ہے' نہ کہ کافر

حتی کہ اگر کوئی شخص کافر ہے تو اس کے کفر سے نفرت کرو' اسکی ذات سے نفرت مت کرو' بلکہ اسکے حق میں دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت عطا فرمائے' آمین۔ دیکھئے: حضور اقدس نبی کریم ﷺ کو کفار کتنی تکالیف پہنچایا کرتے تھے' آپ پر تیر اندازی ہو رہی ہے' پتھر برسائے جا رہے ہیں' آپ کے جسم کے کئی حصے خون سے لہو لہان ہو رہے ہیں' اسکے باوجود اس وقت زبان پر جو کلمات آئے' وہ یہ تھے کہ:

﴿اللّهم اهد قومی فإنهم لایعلمون﴾

اے اللہ' میری قوم کو ہدایت عطا فرما کہ ان کو حقیقت کا پتہ ہی نہیں ہے۔ یہ دیکھئے کہ ان کی معصیت' کفر' شرک' ظلم اور زیادتی کے باوجود ان سے

نفرت کا اظہار نہیں فرمایا۔ بلکہ شفقت کا اظہار فرماتے ہوئے یہ فرمایا کہ یا اللہ یہ ناواقف لوگ ہیں' ان کو حقیقت حال کا پتہ نہیں ہے' اس لئے میرے ساتھ یہ لوگ ایسا برتاؤ کر رہے ہیں' اے اللہ ان کو ہدایت عطا فرما۔ لہٰذا جب کسی کو گناہ میں مبتلا دیکھو تو اس پر ترس کھاؤ اور اس کے لئے دعا کرو اور کوشش کرو کہ وہ اس گناہ سے بچ جائے' اسکو تبلیغ و دعوت کرو' لیکن اس کو حقیر نہ جانو' کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ اسکو توبہ کی توفیق دیدیں اور پھر وہ تم سے بھی آگے نکل جائے۔

حضرت تھانویؒ کا دوسروں کو افضل سمجھنا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کا یہ ارشاد میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے بھی سنا اور حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ سے بھی سنا ہے' وہ یہ کہ میں ہر مسلمان کو اپنے سے حالاً اور ہر کافر کو اپنے آپ سے احتمالاً افضل سمجھتا ہوں "احتمالاً" کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ اس وقت کفر کے اندر مبتلا ہے' لیکن کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ اسکو توبہ کی توفیق عطا فرما دے اور وہ کفر کی مصیبت سے نکل جائے' اور پھر اللہ تعالیٰ اسکے درجات اتنے بلند کر دے کہ وہ مجھ سے بھی آگے بڑھ جائے۔ اور جو شخص مسلمان ہے' صاحب ایمان ہے' اللہ تعالیٰ نے اسکو ایمان کی دولت عطا فرمائی ہے' کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسکے کیا معاملات ہیں' کیونکہ ہر انسان کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختلف معاملات ہوتے ہیں' کسی کے بارے میں ہم کیا رائے ظاہر کریں کہ وہ ایسا ہے' اس لئے میں ہر مسلمان کو اپنے سے افضل سمجھتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس میں جھوٹ اور غلط بیانی کا احتمال تو نہیں ہے کہ ویسے ہی مروتاً یہ کہہ دیا کہ "میں ہر مسلمان کو اپنے سے

افضل سمجھتا ہوں"۔ یقیناً ایسا سمجھتے ہونگے تبھی تو فرمایا۔ بہرحال' کسی کو بھی حقیر سمجھنا' چاہے وہ گناہ اور معصیت کی وجہ سے ہو' جائز نہیں۔

یہ مرض کن لوگوں میں پایا جاتا ہے۔

یہ حقیر سمجھنے کی بات ان لوگوں میں خاص طور پر پیدا ہو جاتی ہے جو لوگ دین کی طرف پلٹتے ہیں' مثلاً شروع میں ان کے حالات دین کے اعتبار سے ٹھیک نہیں تھے' بعد میں دین کی طرف آئے اور نماز روزے کے پابند ہو گئے' اور وضع قطع اور لباس پوشاک شریعت کے مطابق بنا لیا' مسجد میں آنے لگے' نماز باجماعت کے پابند ہو گئے --- ایسے لوگوں کے دلوں میں شیطان یہ بات ڈالتا ہے کہ تم تو اب سیدھے راستے پر آگئے' اور یہ سب مخلوق جو گناہوں میں منہمک ہیں یہ سب تباہ حال ہیں' اور پھر اسکے نتیجے میں یہ لوگ انکو حقیر اور کم تر سمجھنے لگتے ہیں' اور حقارت سے ان کو دیکھتے ہیں' اور ان پر دلخراش انداز میں اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ پھر اسکے نتیجے میں شیطان انکو عجب میں' بڑائی میں' تکبر میں اور خود پسندی میں مبتلا کر دیتا ہے' اور جب انسان کے اندر اپنی بڑائی اور خود پسندی آجائے تو یہ چیز انسان کے سارے اعمال کو ضائع کرنے والی ہے' اسلئے کہ جب انسان کی نظر اس طرف جانے لگے کہ میں بڑا نیک ہوں اور دوسرے بُرے ہیں تو بس انسان عجب میں مبتلا ہو گیا اور عجب کے نتیجے میں اسکے سارے اعمال اکارت ہو گئے۔ اسلئے کہ وہ عمل مقبول ہے جو اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے کیا جائے اور جس عمل کے بعد انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس نے مجھے اسکی توفیق عطا فرمائی ۔ اسلئے کسی کے ساتھ حقارت کا معاملہ نہیں کرنا چاہئے اور کسی کافر اور فاسق و فاجر کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔

کسی کو بیمار دیکھے تو یہ دعا پڑھے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب انسان دوسرے کو کسی بیماری کے اندر مبتلا دیکھے تو یہ دعا پڑھے:

﴿ الحمد لله الذی عافانی مما ابتلاه به، وفضّلنی علی کثیر ممّن خلق تفضیلاً ﴾

(ترمذی کتاب الدعوات، باب مایقول اذا رأی مبتلی)

"اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے اس بیماری سے عافیت عطا فرمائی جس بیماری میں یہ مبتلا ہے' اور بہت سے لوگوں پر آپ نے مجھے فضیلت عطا فرمائی"

یعنی بہت سے لوگ بیماریوں میں مبتلا ہیں' لیکن آپ نے مجھے صحت عطا فرمائی ہے۔ کسی بیمار کو دیکھ کر یہ دعا پڑھنا سنت ہے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی تلقین فرمائی ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمتہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ جب بھی کسی ہسپتال کے پاس سے گزرتا ہوں تو الحمد للہ یہ دعا پڑھ لیتا ہوں' اور ساتھ میں یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ یا اللہ! ان بیماروں کو صحت عطا فرما دیجئے۔

کسی کو گناہ میں مبتلا دیکھے تو یہی دعا پڑھے۔

ہمارے ایک استاد فرمایا کرتے تھے کہ یہ دعا جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیمار کو دیکھ کر پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے' میں تو جب کسی شخص کو کسی گناہ یا معصیت میں مبتلا دیکھتا ہوں تو اس وقت بھی یہی دعا پڑھ لیتا ہوں۔ مثلاً راستے میں گزرتے ہوئے بعض اوقات دیکھتا ہوں کہ لوگ سینما دیکھنے کے لئے یا اس کا ٹکٹ خریدنے کے لئے لائن میں کھڑے ہیں'

ان کو دیکھ کر یہی دعا پڑھ لیتا ہوں' اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس گناہ سے محفوظ رکھا۔ اس دعا کے پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح بیمار ترس کھانے کے قابل ہے' اسی طرح جو شخص گناہ میں مبتلا ہے وہ بھی ترس کھانے کے قابل ہے کہ وہ اس معصیت میں مبتلا ہے' اور اس کے لئے بھی دعا کرنی چاہئے کہ یا اللہ! اس کو اس معصیت سے نکال دیں۔ کیا معلوم کہ آج جو لوگ گناہ کی لائن میں لگے ہوئے ہیں اور آپ ان کو حقیر اور ذلیل سمجھ رہے ہیں' کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ ان کو توبہ کی توفیق دیدیں اور پھر وہ تم سے آگے نکل جائیں۔ اس لئے کس بات پر تم اتراتے ہو؟ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے تم کو گناہوں سے بچنے کی توفیق دیدی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو' اگر ان کو گناہوں سے بچنے کی توفیق نہیں ہوئی تو تم ان کے حق میں دعا کرو' کہ یا اللہ! ان کو ہدایت عطا فرما دے اور ان کو اس بیماری سے نجات عطا فرما دے' آمین۔ بہرحال' کفر سے نفرت ہو' گناہ سے' معصیت اور نافرمانی سے نفرت ہو' لیکن آدمی سے نفرت مت کرو' بلکہ اسکے ساتھ محبت اور شفقت کا معاملہ کرو' اور جب اس سے کوئی بات کہنی ہو تو نرمی اور شفقت سے کہو' ہمدردی اور محبت سے کہو' تاکہ اس پر اثر انداز بھی ہو۔ ہمارے سارے بزرگوں کا یہی معمول رہا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا چور کے پاؤں کو چومنا۔

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ سنا کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کہیں سے گزر رہے تھے' ایک جگہ پر دیکھا کہ ایک آدمی کو سولی پر لٹکایا ہوا ہے اور اس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے' اور ایک پاؤں کٹا ہوا ہے' آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے بتایا

کہ یہ شخص عادی قسم کا چور ہے، جب پہلی مرتبہ پکڑا گیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا، اور جب دوسری مرتبہ پکڑا گیا تو پاؤں کاٹ دیا گیا اور اب جب تیسری مرتبہ پھر پکڑا گیا تو اب اس کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ آگے بڑھے اور اس کے پاؤں چوم لئے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت! یہ اتنا بڑا چور ہے اور عادی چور ہے، آپ اس کا پاؤں چوم رہے ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگرچہ اس نے بہت بڑا جرم اور گناہ کا کام کیا، جسکی وجہ سے اس کو سزا دی گئی۔ لیکن اس شخص کے اندر ایک بہترین وصف ہے، وہ ہے "استقامت" اگرچہ اس وصف کو اس نے غلط جگہ پر استعمال کیا، اس لئے کہ جس کام کو اس نے اپنا مشغلہ بنایا اس پر ڈٹا رہا۔ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا پھر بھی اس کام کو نہیں چھوڑا۔ پاؤں کاٹ دیا گیا پھر بھی اس کام کو نہیں چھوڑا، حتیٰ کہ موت کی سزا ہو گئی لیکن اپنے کام پر لگا رہا، اس سے پتہ چلا کہ اس کے اندر استقامت کا وصف تھا اور اسی وصف کی وجہ سے میں نے اسکے پاؤں چوم لئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی عبادت اور طاعات کے اندر یہ وصف عطا فرما دے۔ آمین۔ بہرحال: جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں وہ آدمی سے نفرت نہیں کرتے، اسکی برائیوں سے نفرت کرتے ہیں، اور وہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی برے آدمی کے اندر اچھائیاں ہیں تو وہ حاصل کرنے کے لائق ہیں، اور اس کے اندر جو برائیاں ہیں اس کو دور کرنے کی فکر کرو۔ اور اس کو محبت اور پیار سے سمجھاؤ، اور اسی سے جا کر بتاؤ دوسروں سے اسکی برائیاں بیان کرتے مت پھرو۔

”ایک مؤمن دوسرے مؤمن کیلئے آئینہ ہے“ کا مطلب۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

﴿ المؤمن مرآة المؤمن ﴾

(ابوداود، کتاب الادب، باب فی النصیحۃ)

ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے، اگر آدمی کے چہرے پر کوئی داغ دھبہ لگ جائے اور وہ آدمی جاکر آئینہ کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ آئینہ بتا دیتا ہے کہ تمہارے چہرے پر یہ داغ لگا ہوا ہے، گویا آئینہ انسان کے عیب بیان کر دیتا ہے، اسی طرح ایک مؤمن بھی دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے، یعنی جب ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے اندر کوئی عیب دیکھے تو اسکو پیار سے محبت سے بتا دے کہ یہ عیب تمہارے اندر موجود ہے، اسکو دور کر لو۔ جیسے اگر کسی انسان کے جسم پر کوئی کیڑا یا چیونٹا چل رہا ہو، اور آپ اس کیڑے کو اسکے جسم پر یا کپڑوں پر چلتا ہوا دیکھ رہے ہیں تو محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ تم اسکو بتا دو کہ دیکھو بھائی! تمہارے جسم پر یہ کیڑا چل رہا ہے، اسکو دور کر لو۔ اسی طرح اگر کسی مسلمان بھائی کے اندر کوئی دینی خرابی ہے تو پیار و محبت سے اسکو بتا دینا چاہئے کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے، اس لئے کہ ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے۔

ایک کے عیب دوسروں کو مت بتاؤ۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جب تم کسی دوسرے کے اندر کوئی عیب دیکھو تو صرف اسی کو بتاؤ کہ تمہارے اندر یہ عیب ہے، دوسروں سے کہتے مت پھرو کہ فلاں کے اندر یہ عیب ہے۔ اس لئے کہ حضور

اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤمن کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے' اور آئینہ صرف اس شخص کو چہرے کے داغ دھبے بتاتا ہے جو شخص اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے' وہ آئینہ دوسروں کو نہیں بتاتا کہ فلاں شخص کے چہرے پر داغ دھبے لگے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ جس کے اندر کوئی برائی یا عیب دیکھے تو صرف اسی سے کہے' دوسروں سے اس کا تذکرہ نہ کرے کہ فلاں کے اندر یہ عیب اور یہ برائی ہے' کیونکہ اگر دوسروں کو اسکے عیوب کے بارے میں بتاؤ گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کام میں تمہاری نفسانیت شامل ہے' پھر وہ دین کا کام نہیں ہو گا۔ اور اگر صرف اسی سے تنہائی میں محبت اور شفقت سے اسکو اسکے عیب پر تنبیہ کرو گے تو یہ اخوت اور ایمان کا تقاضہ ہے' لیکن اسکو حقیر اور ذلیل سمجھنا کسی حال میں بھی جائز نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

﴿وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین﴾

دینی مدارس دین کی حفاظت کے قلعے

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
١٨٨/١، لیاقت آباد، کراچی ١٩

تاریخ خطاب ۲۹ر دسمبر ۱۹۹۴ء

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۷

عرض ناشر

ختم بخاری کے موقع پر دارالعلوم کراچی میں بڑا پر رونق اجتماع ہوتا ہے جس میں باہر سے بھی علماء، طلبہ اور ان مدارس سے تعلق رکھنے والے شہر کے معززین بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں، زیر ملاحظہ مضمون، حضرت مولانا محمد تقی صاحب مدظلہم کا وہ بصیرت افروز خطاب ہے جو شعبان ۱۴۱۵ھ میں اس بابرکت موقع پر انہوں نے حاضرین کے سامنے فرمایا تھا، اور جس میں عربی مدارس سے متعلق بہت سے امور پر حضرت مولانا نے بڑے دلنشین انداز میں مؤثر روشنی ڈالی ہے، مولانا منیب الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم کراچی نے اسے ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے نقل کیا تاکہ قارئین بھی "مخاطب" ہونے کا شرف حاصل کر سکیں، موضوع کی اہمیت کے پیش نظریہ خطاب علیحدہ کتابچے کی شکل میں پیش خدمت ہے۔

ولی اللہ میمن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دینی مدارس
دین کی حفاظت کے قلعے

الحمدلله نحمده ونستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه، ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيات اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له، ونشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريک له، ونشهدان سيدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله، صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله واصحابه وبارک وسلم تسليمًا كثيرًا كثيرا۔

امابعد!

حضرات علماء کرام، میرے عزیز طالب علم ساتھیو اور معزز حاضرین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہید

میرے استاد مکرم شیخ الحدیث حضرت مولانا سحبان محمود صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے درس کے بعد میری لب کشائی یوں تو مناسب نہیں تھی، اس لئے کہ حضرت والا کے درس کے بعد کسی اور بات کی گنجائش نہیں۔ لیکن پھر حضرت نے ہی حکم فرمایا کہ

کچھ کلمات عرض کروں، اور معمول بھی یہ رہا ہے کہ ختم بخاری کے موقع پر میرے برادر بزرگ صدر دارالعلوم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مد ظلہم العالی کچھ بیان فرمایا کرتے ہیں۔ وہ اس وقت سفر پر ہیں۔ اس لئے حضرت کا ارشاد ہوا کہ ان کی نیابت میں کچھ گزارشات آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں ۔

گندم اگر بہم نہ رسد جو غنیمت است

اس لئے حضرت کی تعمیل ارشاد میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔

اللہ جلّ جلالہ کا بے پایاں کرم وانعام ہے جس کا شکر کسی طرح بھی ادا نہیں ہو سکتا کہ آج اس نے اپنے فضل وکرم سے دارالعلوم کی تعلیمی مصروفیات تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ آخری مبارک درس جس میں ابھی اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو شرکت کی سعادت بخشی۔ یہ صحیح بخاری کا آخری درس تھا۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے بعد اس روئے زمین پر سب سے زیادہ صحیح کتاب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب ہے، اور حضرت والا نے سارے سال از اول تا آخر طلبہ کو اس درس سے فیض یاب کیا ہے۔ آج الحمدللہ یہ مبارک سلسلہ تکمیل کو پہنچا، اور اس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے تعلیمی سال کا بھی اختتام ہوا۔ سال کے شروع میں جب تعلیم کا آغاز ہوا تھا تو اس وقت یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کون اس کی تکمیل میں شریک ہو سکے گا اور کون شریک نہیں ہوگا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں یہ موقع عطا فرمایا اور اس کی توفیق عطا فرمائی ـــــ اس پر جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

اللہ کی نعمتیں بے شمار ہیں

انسان پر خالق کائنات کی نعمتیں لامتناہی ہیں، تنہا سانس ہی کی نعمت کو دیکھئے کہ یہ کتنی عظیم نعمت ہے۔ شیخ سعدی نے نہایت آسان طریقہ پر اس بات کو یوں سمجھایا ہے کہ:

"ہر انسان جب ایک سانس لیتا ہے تو ایک سانس کے اندر دو

نعمتیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی جمع ہیں۔ سانس کا اندر جانا ایک نعمت ہے اور باہر آنا دوسری نعمت ہے۔ اگر سانس اندر نہ جائے تو موت ہے، اور اندر جانے کے بعد باہر نہ آئے تو موت ہے۔ اس طرح ایک سانس میں دو نعمتیں جمع ہیں۔ اور ہر نعمت پر شکر ادا کرنا واجب ہے تو ایک سانس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے دو شکر واجب ہوئے۔ اگر انسان صرف سانس کی نعمت پر شکر ادا کرنا چاہے تو ادا نہیں کرسکتا، دیگر نعمتوں کی بات تو دوسری ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتیں بارش کی طرح برس رہی ہیں اور ان کا شمار بھی ممکن نہیں"۔

سب سے عظیم نعمت

لیکن ان تمام نعمتوں میں سب سے جلیل القدر نعمت، سب سے عظیم الشان نعمت جس کے برابر کوئی اور نعمت نہیں ہوسکتی، وہ ایمان کی نعمت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں اپنے فضل وکرم سے ایمان کی نعمت سے نوازا، اس کی قدر وقیمت کا احساس ہم کو اس لئے نہیں ہے کہ یہ نعمت ہم کو ماں باپ سے مفت میں مل گئی، اسے حاصل کرنے کے لئے کوئی دوڑ دھوپ نہیں کرنی پڑی، کوئی قربانی نہیں دینی پڑی، کوئی تکلیف نہیں اٹھانی پڑی۔ اس واسطے اس کی قدر وقیمت کا احساس نہیں ہے۔ اس کی قدر وقیمت پوچھئے بلال حبشیؓ سے، صہیب رومیؓ سے، زید بن حارثہؓ سے، جنہوں نے اس کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی اذیتیں برداشت کیں، قربانیاں جھیلیں، تب جاکر انہیں یہ نعمت حاصل ہوئی۔ چونکہ اللہ جلّ جلالہ نے ہمیں مسلمان گھرانہ میں پیدا کیا، اور بغیر کسی مشقت کے یہ نعمت حاصل ہوگئی، اس لئے اس کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا، ورنہ ساری نعمتوں پر سب سے زیادہ فوقیت رکھنے والی یہی ایمان کی نعمت ہے۔ ایمان کے بعد اس کائنات کی سب سے عظیم نعمت،

ایمان کے تقاضوں کے علم کی نعمت ہے کہ ایمان کیا تقاضا کرتا ہے؟ کیا مطالبات رکھتا ہے؟ اس کے نتیجہ میں انسان کے اوپر کیا فرائض وواجبات عائد ہوتے ہیں؟ یہ علم ایمان کے بعد سب سے بڑی نعمت ہے۔

دینی مدارس اور پروپیگنڈہ

یہ ادارہ دارالعلوم جس کے تعلیمی سال کا آج اختتام ہو رہا ہے، الحمدللہ اسی علم دین کی خدمت کے لئے اور اسی علم کے پہنچانے اور پھیلانے کے لئے کچھ اللہ والوں نے اپنے اخلاص کے ساتھ قائم فرمایا تھا، اور اسی راستہ پر حتی الامکان چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آج کی فضاء میں طرح طرح کے نعرے، طرح طرح کے پروپیگنڈے، طرح طرح کے اعتراضات، ان دینی مدارس پر کئے جارہے ہیں۔ اعتراضات اور طعنوں کا ایک سیلاب ہے، جو ان مدارس کی طرف بہایا جارہا ہے۔ یہ اعتراضات کچھ تو ان معاندین کی طرف سے ہیں جو دین کے دشمن، اسلام کے دشمن اور اس زمین پر اللہ کے کلمہ کے غلبہ کے دشمن ہیں۔ وہ ان مدارس کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات اچھے خاصے پڑھے لکھے اور دین سے تعلق رکھنے والے بھی اس پروپیگنڈہ کا شکار ہوجاتے ہیں۔ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ان دینی مدارس کے بارے میں طرح طرح کے خیالات ان کے دلوں میں پیدا ہوجاتے ہیں۔

مولوی کے ہر کام پر اعتراض

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ بعض اوقات ہنسی میں فرمایا کرتے تھے کہ "یہ مولوی ملامتی فرقہ ہے" یعنی جب کہیں دنیا میں کوئی خرابی ہوگی تو لوگ اس کو مولوی کی طرف موڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولوی کوئی بھی کام کرے، اس میں کوئی نہ کوئی اعتراض کا پہلو ضرور نکال لیتے ہیں۔ مولوی اگر بیچارہ گوشہ نشین ہے اور اللہ اللہ کر رہا ہے، قال اللہ، قال الرسول کا درس دے رہا ہے تو اعتراض یہ ہے کہ یہ مولوی تو دنیا سے بے

خبر ہے، دنیا کہاں جارہی ہے، ان کو اپنے بسم اللہ کے گنبد سے نکلنے کی فرصت نہیں۔ اگر کوئی مولوی بیچارہ اصلاح کے لئے یا کسی اجتماعی کام کے لئے گوشہ سے باہر نکل آئے تو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ مولوی صاحب کا تو کام تھا مدرسہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا اور آج یہ سیاست میں اور حکومت کے معاملات میں دخل انداز ہو رہے ہیں۔

اگر مولوی بیچارہ ایسا ہو کہ اس کے پاس مالی وسائل کا فقدان ہو، فقر و تنگ دستی کا شکار ہو تو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے طالب علموں کے لئے مالی وسائل کا انتظام نہیں کر رکھا ہے، یہ مدرسہ سے نکل کر کہاں جائیں گے؟ کہاں سے روٹی کھائیں گے؟ کہاں سے گزارہ ہوگا؟ اور اگر کسی مولوی کے پاس پیسے زیادہ آگئے تو کہتے ہیں کہ لیجئے یہ مولانا صاحب ہیں؟ یہ تو لکھ پتی اور کروڑ پتی بن گئے، ان کے پاس تو دولت آگئی۔ تو اس بیچارے مولوی کی کسی حالت میں معافی نہیں۔ یہ مولوی ملامتی فرقہ ہے۔

یہ جماعت اسلام کے لئے ڈھال ہے

ایک قوم تو وہ ہے جو باقاعدہ اہتمام کے ساتھ، پروپیگنڈہ کر کے اہل علم اور طلبہ کے خلاف بدگمانیاں پھیلا رہی ہے۔ خوب سمجھ لیں، یہ اسلام دشمنی ہے، اس لئے کہ اسلام کے دشمن اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اس روئے زمین کے اوپر جو طبقہ الحمدللہ اسلام کے لئے ڈھال بنا ہوا ہے وہ یہی بوریہ نشینوں کی جماعت ہے، انہیں بوریہ پر بیٹھنے والوں نے الحمدللہ اسلام کے لئے ڈھال کا کام کیا ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ جب تک مولوی اس روئے زمین پر موجود ہے، انشاء اللہ ثم انشاء اللہ اس زمین سے اسلام کا نشان نہیں مٹایا جاسکتا، اور یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ جس جگہ پر بوریہ نشین مولوی ختم ہو گئے، وہاں اسلام کا کس کس طرح حلیہ بگاڑا گیا، اور اسلام کو مٹانے کی سازشیں کس طرح کامیاب ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ نے بہت دنیا دکھائی ہے، اور عالم اسلام کے ایسے ایسے خطوں میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں اب ان مدارس کا بیج مار دیا گیا ہے، لیکن اس کا نتیجہ کھلی آنکھوں سے

یوں نظر آتا ہے کہ جیسے کسی چرواہے کو قتل کردینے کے بعد بھیڑوں کا کوئی ذمہ دار نہیں ہوتا اور بھیڑیئے انہیں پھاڑ کر کھاجاتے ہیں۔ آج بہت سے خطوں میں عام مسلمانوں کا دینی اعتبار سے یہی حال ہے۔

بغداد میں دینی مدرسہ کی تلاش

میرا بغداد جانا ہوا، بغداد وہ شہر ہے جو صدیوں تک عالمِ اسلام کا پایہ تخت رہا ہے۔ وہاں خلافتِ عباسیہ کا جاہ و جلال دنیا نے دیکھا، اور علوم و فنون کے بازار گرم ہوئے، جب میں وہاں پہنچا تو کسی سے معلوم کیا کہ یہاں کوئی مدرسہ ہے؟ علم دین کا کوئی مرکز ہے جہاں علم دین کی تعلیم دی جاتی ہو؟ میں اس کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔

کسی نے بتایا کہ یہاں ایسے مدرسے کا کوئی نام و نشان نہیں ہے، اب تو سارے مدارس اسکولوں اور کالجوں میں تبدیل ہوچکے ہیں۔ اب دین کی تعلیم کے لئے یونیورسٹیوں کی فیکلٹیز ہیں۔ ان میں دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے، ان کے اساتذہ کو دیکھ کر یہ پتہ چلانا مشکل ہوتا ہے کہ عالم تو کجا، یہ مسلمان بھی ہیں یا نہیں؟ ان اداروں میں مخلوط تعلیم رائج ہے، مرد، عورتیں ایک ساتھ زیرِ تعلیم ہیں، اور اسلام محض ایک نظریہ ہو کر رہ گیا، جس کو تاریخی فلسفے کے طور پر پڑھا پڑھایا جارہا ہے۔ زندگیوں میں اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ جس طرح مستشرقین پڑھتے ہیں۔ آج امریکہ، کینیڈا اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھی اسلامی تعلیم ہورہی ہے، اسلام پڑھایا جارہا ہے۔ وہاں پر بھی حدیث فقہ اور تفسیر کی تعلیم کا انتظام ہے، ان کے مقالات اگر آپ پڑھیں تو ایسی ایسی کتابوں کے نام نظر آئیں گے جن کا ہمارے سیدھے سادے مولویوں کو بھی پتہ نہیں ہوتا۔ بظاہر بڑی تحقیق کے ساتھ کام ہورہا ہے۔ لیکن وہ دین کی کیا تعلیم ہوئی جو انسان کو ایمان کی دولت بھی عطا نہ کرسکے۔ صبح سے شام تک اسلامی علوم کے سمندر میں غوطے لگانے کے باوجود ناکام ہی لوٹتے ہیں، اور اس کے قطرہ سے حلق بھی تر نہیں کرتے، مغرب کی ان تعلیم گاہوں میں کلیۃ شرعیۃ بھی ہے، کلیۃ اصول الدین بھی ہے۔ لیکن

اس کا کوئی اثر زندگی میں نظر نہیں آتا۔ ان علوم کی روح فنا کردی گئی ہے۔

پھر میں نے ان سے عرض کیا کہ کوئی مدرسہ نہ سہی، کوئی عالم جو پرانے طریقوں کے ہوں، مجھے ان کا پتہ بتلادیا جائے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ تو انہوں نے بتایا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ کے مزار مبارک کے قریب ایک مسجد میں مکتب قائم ہے، اس مکتب میں ایک قدیم استاد رہتے ہیں۔ جنہوں نے قدیم طریقہ سے پڑھا ہے، میں تلاش کرتا ہوا ان کی خدمت میں پہنچ گیا، دیکھ کر معلوم ہوا کہ واقعۃً پرانے طرز کے بزرگ ہیں، اور انہیں دیکھ کر احساس ہوا کہ کسی متقی عالم اللہ والے کی زیارت کی ہے۔ انہوں نے بھی بوریہ پر بیٹھ کر پڑھا تھا، یہی روکھی سوکھی کھاکر، موٹا جھوٹا پہن کر تعلیم حاصل کی تھی، چہرے پر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے علوم شریعت کے انوار نظر آئے، اور ان کی خدمت میں تھوڑی دیر بیٹھ کر اندازہ ہوا کہ میں جنّت کی فضاء میں آگیا۔

مدارس کے خاتمہ کو برداشت نہ کرنا

سلام ودعا کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا: آپ کہاں سے آئے؟ میں نے بتایا کہ پاکستان سے آیا ہوں، پھر انہوں نے مجھ سے دارالعلوم کے بارے میں کچھ سوالات کئے کہ جس مدرسہ میں آپ پڑھتے پڑھاتے ہیں وہ کیسا مدرسہ ہے؟ میں نے انہیں تفصیل بتلادی، پوچھنے لگے وہاں کیا پڑھایا جاتا ہے؟ کون سی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں؟ میں نے ان کتابوں کے نام ذکر کئے جو ہمارے یہاں پڑھائی جاتی ہیں تو ان کی چیخ نکل گئی، اور رو پڑے، آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، کہنے لگے، اب تک یہ کتابیں تمہارے یہاں پڑھائی جاتی ہیں؟ میں نے کہا کہ الحمدللہ پڑھائی جاتی ہیں۔ فرمایا کہ ہم تو آج ان کتابوں کا نام سننے سے بھی محروم ہوگئے اور آج ان کا نام سن کر مجھے رونا آگیا۔ یہ کتابیں اللہ والے پیدا کیا کرتی تھیں۔ یہ صحیح مسلمان پیدا کیا کرتی تھیں۔ ہمارے ملک سے تو ان کا خاتمہ ہوگیا، میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں، میرا یہ پیغام آپ اپنے ملک کے اہل علم وعوام تک

پہنچادیجئے کہ اللہ کے لئے ہر چیز کو برداشت کرلینا، مگر اس طرح کے مدرسوں کو ختم کرنے کو ہرگز برداشت نہ کرنا، دشمنان اسلام اس راز سے واقف ہیں کہ جب تک یہ سیدھا سادہ بوریہ پر بیٹھنے والا مولوی اس معاشرہ میں موجود ہے، مسلمانوں کے دلوں سے ایمان کو کھرچا نہیں جاسکتا، لہٰذا دشمنان اسلام نے اس کے خلاف پروپیگنڈہ کے اوپر اپنی پوری مشینری لگائی ہوئی ہے۔

دینی غیرت کے خاتمہ کا ایک علاج

شاعر مشرق اقبال مرحوم کے بارے میں یہ بات بڑی مشہور ہے کہ انہوں نے ملّا کے بارے میں طنز آمیز کلمات کہے ہیں۔ لیکن جگہ جگہ انہوں نے ایسی باتیں بھی کہہ دی ہیں جو انسان کو حقیقت تک پہنچانے والی ہیں۔ ایک جگہ انہوں نے انگریزوں اور دشمنان اسلام کی ترجمانی کرتے ہوئے افغانستان کے بارے میں ایک شعر کہا ہے ۔

افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو ان کے کوہ ودمن سے نکال دو

افغانیوں کی دینی غیرت کو اگر تباہ کرنا چاہتے ہو اور اس کو ختم کرنا چاہتے ہو تو اس کا واحد راستہ یہ ہے کہ ملّا کو اس معاشرے سے نکال دو، جب تک یہ ملّا بیٹھا ہوا ہے، اس وقت تک ان کے دلوں سے ایمان کی غیرت کو نہیں نکالا جاسکتا۔

مدارس پر اعتراضات

غرض مدارس کے بارے میں طرح طرح کے پروپیگنڈے پھیلائے جارہے ہیں کہ یہ چودہ سو سال پرانے لوگ ہیں، دقیانوسی لوگ ہیں۔ یہ رجعت پسند لوگ ہیں۔ ان کو دنیا کے حالات کی خبر نہیں ہے، ان کو اس دنیا میں رہنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ ان کے پاس دنیاوی علوم وفنون نہیں ہیں۔ یہ امّت مسلمہ کا پہیہ الٹا چلانے کی کوشش میں ہیں۔ یہ نعرے مختلف اوقات میں لگائے جاتے رہے ہیں، اور آج پھر پوری شدّت سے ان کی

صدائے بازگشت ہمارے ملک میں سنائی دے رہی ہے۔

یہ اعتراض بھی ہو رہا ہے کہ دینی مدارس دہشت گرد بن گئے ہیں، یہ ترقی کے دشمن ہیں۔ دہشت گردی کا طعنہ ان کے اوپر، بنیاد پرستی کا بھی طعنہ ان کے اوپر، رجعت پسندی کا بھی طعنہ ان کے اوپر۔ تنگ نظری کا بھی طعنہ ان کے اوپر، ترقی کے دشمن ہونے کا بھی طعنہ ان کے اوپر، ساری دنیا کے طعنوں کی بارش اس بیچارے مولوی کے اوپر ہے، لیکن یہ مولوی بہت پکّا ہے۔

مولوی بڑا سخت جان ہے

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ مولوی بڑا سخت جان ہے۔ اس پر ان طعنوں کی کتنی ہی بارش کردو، یہ ہر طرح کے حالات برداشت کرلیتا ہے، اس لئے کہ جب کوئی آدمی اس کوچہ میں داخل ہوتا ہے تو الحمدللہ کمر مضبوط کر کے داخل ہوتا ہے، اس کو پتہ ہے کہ یہ سارے طعنے مجھے برداشت کرنے پڑیں گے۔ دنیا مجھے برا کہے گی، وہ ان سب طعنوں کا استقبال کرتے ہوئے اور خوش آمدید کہتے ہوئے اس میں داخل ہوتا ہے ۔

جس کو ہو جان ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

اس گلی میں تو آتا ہی وہ ہے جس کو معلوم ہے کہ یہ سب طعنے برداشت کرنے پڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ حقیقت بین نگاہ عطا کرے تو یہ طعنے ایک داعی حق کے گلے کا زیور ہیں۔ اس کے سر کا تاج ہیں، یہ وہ طعنے ہیں جو حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے بھی سنے، اور انبیاء کرام کے وارثوں نے بھی سنے، اور قیامت تک یہ طعنے دیئے جاتے رہیں گے ـــــــ اللہ تعالیٰ اپنے سیدھے راستہ پر رکھے، اخلاص عطا فرمائے۔ اپنی رضاجوئی کی فکر عطا فرمائے آمین ـــــــ یہ طعنے بے حقیقت ہیں۔ ایک دن وہ آئے گا جب یہ مولوی انشاء اللہ تعالیٰ یہ کہنے کی پوزیشن میں ہوگا۔

﴿فالیوم الذین امنوا من الکفّار یضحکون﴾ (المطففین:۳۴)

وہ وقت آئے گا، جب طعنے دینے والوں کے گلے بیٹھ جائیں گے، ان کی آواز دھیمی پڑ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس طبقے کو عزت و شوکت عطا فرمائیں گے جس طبقے کو آج بے حقیقت سمجھا جاتا ہے۔

﴿وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین﴾ (المنافقون:۸)

عزت در حقیقت اللہ تبارک و تعالیٰ ہی عطا فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ دینی مدارس ان طعنوں کے طوفان میں الحمد للہ چل رہے ہیں۔ اور جب تک اللہ جلّ جلالہ کو اس دین حق کا بقاء منظور ہے، اس وقت تک انشاء اللہ یہ مدارس موجود رہیں گے، لوگ ہزار طعنے دیا کریں، ان کے طعنوں کی کوئی پرواہ نہیں۔

مولوی کی روٹی کی فکر چھوڑ دو

آج ہمارے ماحول کے اندر بار بار یہ آوازیں اٹھتی ہیں کہ ان دینی مدارس کو بند کردیا جائے ان کو ختم کردیا جائے، بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اگرچہ عناد کی وجہ سے نہیں، لیکن ہمدردی ہی کے پیرایہ میں ان نعروں کے ساتھ ہم آواز ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات اپنی دانست میں اصلاح ہی کی غرض سے مشورے دیتے ہیں۔

کبھی کوئی یہ کہہ دیتا ہے کہ مولویوں کے کھانے، کمانے کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ لہٰذا ان کو کوئی ہنر سکھانا چاہئے۔ بڑھئی کا کام سکھادو، کچھ لوہار کا کام سکھادو، کچھ ایسے صنعتی کام سکھادو کہ یہ اپنی روٹی کما سکیں، لوگ طرح طرح کی تجویزیں لے کر آتے ہیں کہ ایک دار الصنائع قائم کردو، تاکہ ان مولویوں کی روٹی کا بندوبست ہو جائے۔

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کے لئے اس مولوی کی روٹی کی فکر چھوڑ دو، یہ اپنی روٹی خود کھا کما لے گا، اس کی فکر چھوڑ دو، مجھے کچھ مثالیں ایسی دے دو کہ کسی مولوی نے فقر و فاقہ کی وجہ سے خود کشی کی ہو۔ بہت سے پی ایچ ڈی اور ماسٹر ڈگری رکھنے والوں کی مثالیں میں دے دیتا ہوں جنہوں نے خود کشی کی، اور حالات

سے تنگ آکر اپنے آپ کو ختم کرڈالا۔ اور بہت سے ایسے ملیں گے جو ان ڈگریوں کو لئے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں لیکن نوکری نہیں ملتی، لیکن ایک مولوی ایسا نہیں بتاسکتے جس نے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی ہو، یا اس کے بارے میں یہ کہا گیا ہو کہ وہ بیکار بیٹھا ہوا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے مولوی کا بھی انتظام کردیتے ہیں۔ دوسروں سے بہت اچھا انتظام فرماتے ہیں۔

اس دنیا کو ٹھکرادو

میرے طالب علم ساتھیو! اچھی طرح سمجھ لو، اس دنیا کا خاصّہ یہ ہے کہ جتنا آدمی اس دنیا کے پیچھے دوڑے گا، دنیا اس سے بھاگے گی، اور جتنا اس دنیا سے بھاگے گا، دنیا اس کے پیچھے بھاگے گی۔ کسی نے اس کی مثال سائے سے دی ہے، اگر کوئی آدمی سائے کے پیچھے بھاگنا شروع کردے تو سایہ اس سے آگے آگے بڑھتا رہے گا اور وہ سائے کو پکڑ نہیں سکے گا، اور اگر کوئی شخص پیٹھ موڑ کر بھاگنا شروع کردے تو سایہ اس کے پیچھے بھاگنا شروع کردے گا۔ اسی طرح انسان جتنا اس دنیا کا طالب ہوگا، دنیا اس سے دور بھاگے گی اور جتنا اس سے دور بھاگے گا اور اس سے سچے دل سے منہ موڑ لے گا تو دنیا اس کے آگے ذلیل ہو کر آئے گی، وہ ٹھوکریں مارے گا، مگر دنیا اس کے قدموں پر آکر گرے گی۔ اور عام طور پر دیکھ لو، اللہ کے جن بندوں نے اللہ پر بھروسہ کرکے اللہ کے دین کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کردیا اور اس کی خاطر دنیا کو ایک مرتبہ ٹھوکر ماردی تو اللہ نے ان کے قدموں میں دنیا کو اس طرح بھیج دیا کہ دوسرے رشک کرتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ایسا انتظام کرتے ہیں اور آنکھوں سے دکھاتے ہیں کہ اللہ والوں کی عزت کیا ہے؟ رب کریم ہمیں اپنے فضل وکرم سے اخلاص عطا فرمائے، اور اپنا بنالے۔ اور ہمارے دلوں کے اندر یہ جذبہ پیدا فرمادے اور ہمیں اپنی زندگیاں اپنے دین کی خاطر وقف کرنے کی توفیق عطا فرمادے آمین۔ اور پھر انشاء اللہ دنیا و آخرت میں کہیں گھاٹا نہیں ——— لہٰذا مولوی کی روٹی کی فکر آپ چھوڑ دیں، اللہ تبارک وتعالیٰ بہترین

کفیل ہے ــــــ حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ خالق کائنات کتوں کو روزی دیتا ہے، گدھوں کو دیتا ہے، خنزیروں کو دیتا ہے، وہ اپنے دین کے حاملوں کو کیوں نہیں دے گا، اس لئے تم یہ فکر چھوڑ دو۔

مولوی کو لوہار اور بڑھئی مت بناؤ

ایک دین کے حامل کو دین کا پیغام مؤثر انداز میں پہنچانے کے لئے اور اس کو دنیا میں پھیلانے کے لئے بعض دنیاوی علوم وفنون کی بھی ضرورت ہے، اور فقیہ وہ ہے جو حالات زمانہ سے واقف ہو، اس نیت سے وہ جو کچھ پڑھے اور پڑھائے، وہ دین کا ہی حصہ ہے۔ لیکن یاد رکھو، اگر ایک مرتبہ آپ نے مولوی کو بڑھئی یا لوہار بنادیا تو پھر وہ بڑھئی یا لوہار ہی ہو جائے گا۔ میرے والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ منطق کا قاعدہ ہے کہ نتیجہ ہمیشہ ارذل کے تابع ہوتا ہے، ایک مولوی ہے اس نے بڑھئی یا لوہار کا کام بھی سیکھ لیا، اور اس نے یہ سوچا کہ سارا وقت تو بڑھئی یا لوہار کے کام میں لگاؤں گا، اور اللہ تعالیٰ موقع دے گا تو بغیر تنخواہ کے دین کی خدمت کروں گا تو ایسا مولوی بڑھئی یا لوہار ہی بن جائے گا، لیکن دین کا کام نہیں کر سکے گا۔

ایک سبق آموز واقعہ

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ نے ایک واقعہ سنایا تھا کہ: ہمارے ایک بڑے بزرگ دارالعلوم دیوبند کے نامی گرامی استاذ حضرت مولانا محمد سہول عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، یہ حضرت شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد تھے، علم وادب میں بہت آگے تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں پڑھایا کرتے تھے، پڑھاتے پڑھاتے خیال آیا کہ ہم مدرسے میں پڑھا کر تنخواہ لیتے ہیں، یہ تو مزدوری ہوئی، دین کی خدمت نہ ہوئی، دین کی خدمت تو وہ ہے جو بغیر تنخواہ کے کی جائے، ہم جو تنخواہ لے کر پڑھاتے ہیں، معلوم نہیں اس کا اجر بھی ملے گا یا نہیں؟ اس واسطے اپنے لئے کوئی

ایسا ذریعہ معاش تلاش کریں کہ اپنا گزارہ اسی میں ہو جائے، اور فارغ وقت میں اللہ کے دین کی خدمت بغیر معاوضہ کے کریں، مثلاً کہیں وعظ کر دیا، کہیں تقریر کر دی، کبھی فتویٰ لکھ دیا، چنانچہ اسی دوران ایک سرکاری تعلیم گاہ سے ایک پیش کش آگئی کہ آپ ہمارے یہاں آکر پڑھائیں، اتنی تنخواہ آپ کو دی جائے گی۔ (یہ آپ جانتے ہیں کہ سرکاری اداروں کے اندر استاد کا کام بڑا ہلکا ہوتا ہے، سارے دن میں گھنٹہ دو گھنٹہ پڑھانے کے ہوتے ہیں اور پڑھانے میں بھی ایسا مواد نہیں ہوتا کہ اس کے مطالعہ میں کوئی مشکل پیدا ہو، یہ تو دینی مدارس ہی ہیں کہ مولوی پانچ گھنٹے پڑھاتا ہے اور پانچ گھنٹے پڑھانے کے لئے دس گھنٹے مطالعہ کرتا ہے، کولہو کے بیل کی طرح کام کرتا ہے، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یہ کولہو کا بیل نہیں پایا جاتا) بہرحال، مولانا نے سوچا کہ دین کی خدمت کرنے کا یہ اچھا موقع ہے، وہاں دو گھنٹے پڑھاؤں گا۔ باقی وقت بغیر اجرت و معاوضہ کے دین کی خدمت انجام دوں گا۔ اسی جذبے کے تحت حضرت شیخ الہند سے عرض کیا کہ حضرت مجھے یہ پیش کش آئی ہے اور اس غرض سے جانا چاہتا ہوں، حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ: اچھا بھئی تمہارے دل کے اندر داعیہ ہے تو جاکے دیکھ لو، حضرت نے سوچا کہ ان کے دل میں داعیہ قوی ہے، اور اس وقت روکنا مناسب نہیں، اس لئے اجازت دے دی اور وہ چلے گئے۔ چھ مہینے گزر گئے، چھ مہینے کے بعد چھٹیوں میں دیوبند آئے تو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی ہی ملاقات میں پوچھا کہ مولانا سہول صاحب! آپ اس خیال سے گئے تھے کہ سرکاری مدرسہ میں پڑھانے کے اوقات کے علاوہ دین کی خدمت انجام دیں گے، یہ بتاؤ کہ اس عرصہ میں کتنی تصانیف لکھیں؟ کتنے فتوے لکھے؟ اور کتنے وعظ کہے؟ اس کا حساب تو دے دو، تو مولانا رو پڑے، اور فرمایا کہ حضرت یہ شیطانی دھوکہ تھا، اس لئے کہ دارالعلوم میں رہ کر اللہ تعالیٰ خدمتِ دین کی جو توفیق عطا فرماتے تھے، وہاں جاکر اس کی آدھی بھی توفیق نہیں رہی۔ حالانکہ فارغ وقت کئی گنا زیادہ تھا۔

یہ واقعہ سنانے کے بعد میرے والد قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تبارک

وتعالیٰ نے ان مدارس کی فضا میں ایک خاص برکت اور نور رکھا ہے اور اس میں رہ کر اللہ تبارک وتعالیٰ خدمتِ دین کی یہ توفیق عطا فرمادیتے ہیں، بس اللہ تعالیٰ اخلاص عطا فرمائے، اور یہ تنخواہ جو مل رہی ہے یہ تنخواہ نہیں ہے، یہ درحقیقت نفقہ اور خرچہ ہے، اور اس نفقہ پر رہتے ہوئے کام کرو تو اللہ تبارک وتعالیٰ خدمت دین کی توفیق عطا فرمادیتے ہیں۔ انشاء اللہ۔

درس وتدریس کی برکت

میں اپنا ذاتی تجربہ عرض کرتا ہوں، اور شاید میرے سارے رفقاء اس کی تائید فرمائیں گے کہ جس زمانہ میں دارالعلوم میں درس جاری رہتا ہے اس زمانہ کا مقابلہ چھٹی کے زمانہ سے کرکے دیکھ لو، جب چھٹی کا زمانہ آتا ہے تو ہم پہلے سے منصوبے بناتے ہیں کہ فلاں فلاں کام کریں گے، لیکن جتنا کام درس کے زمانہ میں ہوجاتا ہے چھٹی کے زمانہ میں نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ درس کی وجہ سے برکت عطا فرمادیتے ہیں۔

طلبہ کا کیریئر آخرت سنوارنا

اس سال دارالعلوم میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد دو ہزار آٹھ سو پچاس ہے۔ اور قرآن کریم کے جو مکاتب شہر میں قائم ہیں۔ ان میں طلبہ کی تعداد پانچ چھ ہزار سے زیادہ ہے، دورۂ حدیث میں ایک سو اٹھاون طالب علم تھے جو اس سال فارغ التحصیل ہورہے ہیں۔ الحمدللہ عالم بن رہے ہیں۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ اتنی ساری تعداد کہاں کھپے گی، ایک لفظ زبان زد ہے کہ ان کا کیریئر کیا ہے؟ ان کا مستقبل کیا ہے؟ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا:

حضرت معروف کرخیؒ کا ایک واقعہ

حضرت معروف کرخیؒ بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ بغداد میں ان کا مزار

ہے، میں بھی الحمدللہ ان کے مزار پر حاضر ہوا ہوں۔ ایک مرتبہ دجلہ کے کنارے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جارہے تھے۔ اسی دوران دریائے دجلہ میں ایک کشتی گزری جس میں کچھ آزاد منش نوجوان سوار تھے، اور گاتے بجاتے جارہے تھے، شوخیوں اور رنگ رلیوں میں مست تھے، کشتی جب حضرت معروف کرخیؒ کے پاس سے گزری تو ان کو دیکھ کر ان نوجوانوں کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی، کوئی جملہ بھی چست کردیا، رنگ رلیوں کے دوران کوئی مولوی آجائے اور اس پر کوئی جملہ کس دیا جائے، اس سے اچھی کیا بات ہے؟ حضرت معروف کرخیؒ کے برابر میں جو صاحب تھے، انہوں نے عرض کیا کہ:

حضرت یہ اوباش لوگ جو خود تو فسق وفجور میں مبتلا ہیں ہی، یہ اللہ والوں کی شان میں بھی گستاخی کرتے ہیں۔ آپ ان کے لئے بددعا کردیجئے۔ حضرت معروف کرخیؒ نے ہاتھ اٹھائے اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا:

"یا اللہ! آپ نے ان نوجوانوں کو دنیاوی مسرّتیں عطا فرمائی ہیں،
یااللہ ان کو آخرت کی بھی مسرّتیں عطا فرما"۔

آپ کا ساتھی کہنے لگا کہ: حضرت آپ نے تو ان کے حق میں بددعا کرنے کے بجائے دعا کردی۔ حضرت کرخیؒ نے جواب دیا کہ میرا کیا نقصان ہوا؟ میں نے تو ان کے لئے آخرت کی مسرّتوں کی دعا کی ہے، اور آخرت میں مسرّتیں تب ہی حاصل ہوسکتی ہیں جب یہ صحیح معنی میں مسلمان اور نیک بنیں۔

بہرحال، جو آدمی مدرسہ میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آیا ہے وہ درحقیقت حضرت معروف کرخیؒ کی اس بات پر عمل کرتا ہے کہ میرے دوسرے مسلمان بھائیوں کی جس طرح دنیا بہتر ہے، اللہ تعالیٰ ان کی آخرت کو بھی بہتر کردے۔ یہ طلبہ اپنی اور دوسروں کی آخرت بہتر بنانے کے لئے یہاں آتے ہیں، یہی ان کا کیریئر ہے اور یہی ان کا مستقبل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مستقبل کو خراب نہیں کرتے۔ کسی کو ان کی فکر کی ضرورت نہیں، فکر کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل وکرم سے ایمان پر قائم رکھے، اور دین کے تقاضوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مدارس کی آمدنی اور مصارف

اس دارالعلوم کا ماہانہ خرچ لاکھوں روپے میں ہے اور اس کا کوئی بجٹ نہیں بنتا، اتنے بڑے خرچ کا کوئی ادارہ دینی مدارس کے علاوہ آپ مجھے دکھادیجئے جس کا بجٹ نہ بنتا ہو، بجٹ وہاں بنتا ہے جہاں آمدنی کے ذرائع متعین ہوں، آمدنی ہی کے دائرے میں اخراجات کا میزانیہ بنایا جاتا ہے، جبکہ ہمیں نہیں معلوم کہ آئندہ کتنی آمدنی ہوگی؟ آج تک کبھی بجٹ کی بنیاد پر کوئی کام نہیں ہوا۔ اور اللہ کے فضل وکرم سے ضرورت کے سب کام ہوجاتے ہیں۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ سالانہ اتنا بڑا خرچہ ہے تو آمدنی کیا ہے؟ مستقل آمدنی جس کے بارے میں یقین سے میں بتلاسکوں، کچھ نہیں ہے البتہ کچھ مکانات وقف کے ہیں ان کے کرایہ کی مجموعی آمدنی بمشکل پچاس ساٹھ ہزار کے قریب ہوگی، لوگ پوچھتے ہیں کہ پھر مزید خرچہ کہاں سے آتا ہے؟ میں جواب میں عرض کیا کرتا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں کہ کہاں سے آتا ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں، باقی کہاں سے آرہے ہیں اور کس طرح آرہے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔

دارالعلوم کی طرف سے نہ کوئی اشتہار ہے، نہ کوئی اعلان ہے نہ اپیل کی جاتی ہے کہ دارالعلوم کے اندر اتنا خرچ ہوتا ہے آپ اس میں چندہ دیں۔ فون اٹھا کر کسی سے ذکر کرنے کا بھی معمول نہیں ہے۔ آج سے پندرہ دن پہلے جب میں سفر پر جارہا تھا تو اس وقت پتہ چلا کہ شعبان کے مہینے کے اخراجات موجود نہیں ہیں۔ جو بیلنس ہے وہ شعبان کے اخراجات کے لئے بھی کافی نہیں۔ اس وقت بھی کسی سے ذکر نہیں کیا، البتہ ایک دوست اتفاق سے آگئے، ان سے ضمناً ذکر آگیا، پھر معلوم نہیں کیا کہ کیا ہوا؟

اللہ سے مانگ لیتے ہیں

البتہ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ایک بات سکھا گئے ہیں کہ جب کبھی ایسا موقع آئے تو ہاتھ اٹھا کر اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگ لیا کرو، تو الحمدللہ اس کی توفیق ہوئی۔ اللہ

تبارک وتعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلادیئے اور مانگ لیا۔ میں نے آنے کے بعد ابھی تک پوچھا بھی نہیں کہ پوزیشن کیا ہے؟ ابھی تک معلوم نہیں، لیکن الحمدللہ ضرورت کا کوئی کام اللہ تبارک وتعالیٰ روکتے نہیں۔ یہ ہمارے والد ماجد کے اخلاص کا اور ان کی نالہ نیم شبی کا، اور میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحئیؒ کی دعاؤں کا اور ان کے اخلاص کا صدقہ ہے۔

اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے۔ اگر ہمارے زور بازو پر چھوڑا جاتا تو اتنا بڑا ادارہ نہیں چل سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ان بزرگوں کی دعاؤں اور اخلاص کے نتیجہ میں الحمدللہ اس کو چلارہے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ خود اس کے کفیل ہیں۔

یہ مدرسہ ہے دکان نہیں ہے

میرے والد ماجد نے یہ بات فرمائی تھی کہ ہم نے کوئی دکان نہیں کھولی ہے۔ جس کا ہردم، ہر آن چلتا رہنا ضروری ہو، جب تک اصول صحیحہ سے اس کو چلاسکو چلاؤ، جب یہ خیال ہو کہ اصول کو پامال کرنا پڑے گا، اور دین کی بے عزتی کرنی پڑے گی۔ اسے تالہ ڈال دینا اور بند کردینا، یہ وصیت کرکے تشریف لے گئے۔ الحمدللہ آج تک اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے، اپنی رحمت سے، اس کو چلارہے ہیں۔ یہ مثال دنیا کے کسی ادارہ میں نہیں ملے گی۔ یہ اللہ جلّ جلالہ کی قدرت کا کرشمہ ہے، جس کو ہر انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ بے شک کوئی آدمی اس میں اصلاحات کی غرض سے کوئی تجویز پیش کرے تو اس کا خیرمقدم کرنے کے لئے تیار ہیں۔

لیکن کوئی شخص یہ چاہے کہ یہ دینی مدرسہ اپنی روش سے ہٹ کر کسی اور طریقے میں تبدیل ہوجائے۔ یہ انشاء اللہ کبھی نہیں ہوگا۔ جب تک ہمارے دم میں دم ہے، اور جب تک سانس میں سانس ہے، یہ اپنی روش سے نہیں ہٹے گا، انشاء اللہ اور جس دن اس کو ہٹانا پڑا، اس دن اس کو بند کردیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس مزاج کے ساتھ قیامت تک قائم رکھے اور اس کو اپنی رضا کے مطابق چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں نے

آپ کا وقت لے لیا، لیکن یہ ایک ضروری بات تھی جو کہنی ضروری تھی۔

تم اپنی قدر پہچانو

میرے طالب علم ساتھیو!

آپ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اس دنیا میں جاؤ گے، جس میں لوگ طعنوں اور اعتراضات کے تیر کمانوں میں چڑھائے ہوئے ہیں، جہاں پہنچو گے وہاں ان تیروں اور طعنوں کی بارش ہوگی، لیکن یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کے سپاہی ہو۔

میرے بزرگ حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ اسی مسجد میں بیٹھ کر صرف ایک جملہ فرما گئے تھے۔ وہ اپنے دل پر نقش کرلو، وہ جملہ یہ ہے:

"طالب علمو! اپنی قدر پہچانو"

اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم کو علم کی دولت سے نوازا ہے، اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنے دین کی خدمت کے لئے چُنا ہے۔

یہ نعمت اور یہ عزت تمام دنیا پر بھاری ہے، خواہ یہ دنیا والے کتنے ہی اعتراضات کریں۔ تمہارے دل کے اندر اپنے دین کی عزت ہوگی تو اس کو کوئی نہیں مٹا سکے گا۔ جب تم اس یقین کے ساتھ دنیا میں جاؤ گے تو انشاء اللہ تم ہر جگہ سربلند ہوگے۔ بشرطیکہ تم نے جو علم یہاں حاصل کیا ہے اس کو اپنی زندگیوں میں اپناؤ۔ اور اس کو دنیا میں پھیلانے اور پہنچانے کی کوشش کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں قدم قدم پر اپنی نصرت سے نوازے، تمہارے لئے قدم قدم پر کامیابیوں اور کامرانیوں کے دروازے کھولے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمیشہ اپنے دین پر قائم رہنے اور اس علم کی قدر پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ تمہارا حامی اور ناصر ہو۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بیماری اور
پریشانی ایک نعمت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۰۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۲۳ راگست ۱۹۹۶ء

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیماری اور پریشانی ایک نعمت

الحمدلله نحمده ونستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيات اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له ونشهدان سيدنا وسندنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى اله واصحابه وبارك وسلم تسليما كثيرا كثيرا۔

امابعد!

﴿فقد قال النبى صلى الله عليه وسلم: اشد الناس بلاءً الانبياء ثم الأمثل فالأمثل﴾

پریشان حال کے لئے بشارت

اس حدیث میں اس شخص کے لئے بشارت ہے جو مختلف پریشانیوں میں اور تکلیفوں میں مبتلا ہو اور ان پریشانیوں کے باوجود اس کا رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو اور وہ دعا کے ذریعہ اپنی اس تکلیف اور پریشانی کو دور کرنے کی فکر کر رہا ہو۔ ایسے شخص کے لئے اس حدیث میں بشارت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبّت میں اور اپنے فضل و کرم سے یہ تکلیف دی ہے اور اس تکلیف کا منشاء اللہ تعالیٰ کی ناراضگی نہیں ہے۔

پریشانیوں کی دو قسمیں

جب انسان کسی پریشانی میں ہو۔ یا کسی بیماری یا تکلیف میں ہو۔ یا افلاس اور تنگ دستی میں ہو یا قرض کی پریشانی یا بیروزگاری کی پریشانی میں ہو۔ یا گھر کی طرف سے پریشانی ہو۔ اس قسم کی جتنی پریشانیاں جو انسان کو دنیا میں پیش آتی ہیں یہ دو قسم کی ہوتی ہیں۔ پہلی قسم کی پریشانیاں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قہر اور عذاب ہوتا ہے۔ گناہوں کی اصل سزا تو انسان کو آخرت میں ملنی ہے۔ لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ انسان کو دنیا میں بھی عذاب کا مزہ چکھا دیتے ہیں۔ جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿ولنذيقنهم من العذاب الادنى دون العذاب الاكبر لعلهم يرجعون﴾

یعنی آخرت میں جو بڑا عذاب آنے والا ہے ہم اس سے پہلے دنیا میں بھی تھوڑا سا عذاب چکھا دیتے ہیں تاکہ یہ لوگ اپنی بداعمالیوں سے باز آجائیں۔ اور دوسری قسم کی تکالیف اور پریشانیاں وہ ہوتی ہیں جن کے ذریعہ بندے کے درجات بلند کرنے ہوتے ہیں۔ اور اس کے درجات کی بلندی اور اس کو اجر و ثواب دینے کے لئے اس کو تکلیفیں دی جاتی ہیں۔

"تکالیف" اللہ کا عذاب ہیں

لیکن دونوں قسم کی پریشانیوں اور تکالیف میں فرق کس طرح کریں گے کہ یہ پہلی قسم کی پریشانی ہے یا دوسری قسم کی پریشانی ہے؟ ان دونوں قسموں کی پریشانیوں اور تکالیف کی علامات الگ الگ ہیں۔ وہ یہ کہ اگر انسان ان تکالیف کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چھوڑ دے اور اس تکلیف کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ کرنے لگے۔ مثلاً یہ کہنے لگے کہ (نعوذ باللہ) اس تکلیف اور پریشانی کے لئے میں ہی رہ گیا تھا، میرے اوپر یہ تکلیف کیوں آرہی ہے؟ یہ پریشانی مجھے کیوں دی جارہی ہے؟ وغیرہ اور

اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے ہوئے احکام چھوڑ دے، مثلاً پہلے نماز پڑھتا تھا اب تکلیف کی وجہ سے نماز پڑھنا چھوڑ دیا یا پہلے ذکر واذکار کے معمولات کا پابند تھا اب وہ معمولات چھوڑ دیے اور اس تکلیف کو دور کرنے کے لئے دوسرے ظاہری اسباب تو اختیار کر رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار نہیں کرتا۔ دعا نہیں کرتا۔ یہ اس بات کی علامات ہیں کہ جو تکلیف اس پر آئی ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس انسان پر قہر اور عذاب ہے اور سزا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مؤمن کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

''تکالیف'' اللہ کی رحمت بھی ہیں

اور اگر تکالیف آنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر رہا ہے اور دعا کر رہا ہے کہ یا اللہ! میں کمزور ہوں۔ اس تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یا اللہ! مجھے اس تکلیف سے اپنی رحمت سے نجات دے دیجئے۔ اور دل کے اندر اس تکلیف پر شکوہ نہیں ہے وہ اس تکلیف کا احساس تو کر رہا ہے، رو بھی رہا ہے، رنج اور غم کا اظہار بھی کر رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر شکوہ نہیں کر رہا ہے بلکہ اس تکلیف میں وہ پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ پہلے سے زیادہ نمازیں پڑھ رہا ہے۔ پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہا ہے۔ تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور ترقی درجات ہے اور یہ تکالیف اس کے لئے اجر وثواب کا باعث ہیں۔ اور یہ تکلیف بھی اس کے لئے رحمت ہے۔ اور یہ اس انسان کے ساتھ اللہ کی محبت کی دلیل اور علامت ہے۔

کوئی شخص پریشانی سے خالی نہیں

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی کو دوسرے سے محبت ہوتی ہے تو محبت میں تو اس کو آرام پہنچایا جاتا ہے، راحت دی جاتی ہے تو جب اللہ تعالیٰ کو اس بندے سے محبت ہے تو اس بندے کو آرام پہنچانا چاہئے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو تکلیف کیوں دے

رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کو کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ کوئی نہ کوئی صدمہ اور پریشانی نہ ہو۔ چاہے وہ بڑے سے بڑا نبی اور پیغمبر ہو، ولی اور صوفی ہو، یا بادشاہ ہو، یا سرمایہ دار ہو۔ ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ دنیا میں تکلیف کے بغیر زندگی گزارے، اس لئے کہ یہ عالم یعنی دنیا اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہے کہ اس میں غم اور خوشی، راحت اور تکلیف سب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ خالص خوشی اور راحت کا مقام دنیا نہیں ہے۔ بلکہ وہ عالم جنت ہے۔ جس کے بارے میں فرمایا کہ لاخوف علیہم ولا ھم یحزنون یعنی وہاں نہ کوئی خوف ہے اور نہ غم ہے۔ اصل خوشی اور راحت کا مقام تو وہ ہے۔ دنیا تو اللہ تعالیٰ نے بنائی ہی ایسی ہے کہ اس میں کبھی خوشی ہوگی اور کبھی غم ہوگا، کبھی سردی ہوگی کبھی گرمی ہوگی۔ کبھی دھوپ ہوگی کبھی چھاؤں ہوگی۔ کبھی ایک حالت ہوگی کبھی دوسری حالت ہوگی۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص اس دنیا میں بے غم ہو کر بیٹھ جائے۔

ایک نصیحت آموز قصّہ

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے اپنے مواعظ میں ایک قِصّہ لکھا ہے کہ ایک شخص کی حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہو گئی۔ اس شخص نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا کہ حضرت! میرے لئے یہ دعا فرمادیں کہ مجھے زندگی میں کوئی غم اور تکلیف نہ آئے اور ساری زندگی بے غم گزر جائے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ دعا تو میں نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ اس دنیا میں غم اور تکلیف تو آئے گی۔ البتہ ایک کام کر سکتا ہوں وہ یہ کہ تم دنیا میں ایسا آدمی تلاش کرو جو تمہیں سب سے زیادہ بے غم یا کم غم والا نظر آئے۔ پھر مجھے اس شخص کا پتہ بتادینا، میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کردوں گا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس جیسا بنادے۔ یہ شخص بہت خوش ہوا کہ چلو ایسا آدمی تو مل جائے گا جو بہت زیادہ آرام اور راحت میں ہوگا اور میں اس جیسا بننے کی دعا کرالوں گا۔ اب تلاش کرنے کے لئے نکلا، کبھی ایک آدمی کے بارے میں فیصلہ کرتا کہ اس جیسا بننے کی

دعا کراؤں گا۔ پھر دوسرا آدمی اس سے زیادہ دولت مند نظر آتا تو پھر یہ فیصلہ بدل دیتا کہ نہیں، اس جیسا بننے کی دعا کراؤں گا۔ غرض کافی عرصہ تک تلاش کرنے کے بعد اس کو ایک جوہری اور زرگر نظر آیا جو سونا چاندی، جواہرات اور قیمتی پتھر کی تجارت کرتا تھا۔ بہت بڑی اور آراستہ اس کی دوکان تھی، اس کا محل بڑا عالی شان تھا۔ بڑی قیمتی اور اعلیٰ قسم کی سواری تھی۔ نوکر چاکر خدمت میں لگے ہوئے تھے، اس کے بیٹے بڑے خوبصورت اور نوجوان تھے۔ ظاہری حالات دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص بڑے عیش و آرام میں ہے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس جیسا بننے کی دعا کراؤں گا۔ جب واپس جانے لگا تو خیال آیا کہ اس شخص کی ظاہری حالت تو بہت اچھی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اندر سے کسی بیماری یا پریشانی میں مبتلا ہو۔ جس کی وجہ سے میری موجودہ حالت بھی ختم ہوجائے۔ اس لئے اس جوہری سے جاکر پوچھنا چاہئے کہ وہ کس حالت میں ہے۔ چنانچہ یہ شخص اس جوہری کے پاس گیا اور اس سے جاکر کہا کہ تم بڑے عیش و آرام میں زندگی گزار رہے ہو۔ دولت کی ریل پیل ہے، نوکر چاکر لگے ہوئے ہیں۔ تو میں تم جیسا بننا چاہتا ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اندرونی طور پر تمہیں کوئی پریشانی لاحق ہو اور کسی بیماری یا مصیبت کے اندر مبتلا ہو؟

وہ جوہری اس شخص کو تنہائی میں لے گیا اور اس سے کہا کہ تمہارا خیال یہ ہے کہ میں بڑے عیش و آرام میں ہوں۔ بڑا دولت مند ہوں۔ بڑے نوکر چاکر خدمت گزاری میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن اس دنیا میں مجھ سے زیادہ غم اور تکلیف میں کوئی شخص نہیں ہوگا، پھر اس نے اپنی بیوی کی اخلاقی حالت کا بڑا عبرت ناک قصّہ سناتے ہوئے کہا کہ یہ خوبصورت اور جوان بیٹے جو تمہیں نظر آرہے ہیں یہ حقیقت میں میرے بیٹے نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے میرا کوئی لمحہ اذیت اور پریشانی سے خالی نہیں گزرتا اور اندر سے میرے دل میں غم اور صدمہ کی جو آگ سلگ رہی ہے تم اس سے واقف نہیں ہو۔ اس لئے میرا جیسا بننے کی ہرگز دعا مت کرانا۔ اب اس شخص کو پتہ چلا کہ جتنے لوگ مال و دولت اور عیش و آرام میں نظر آرہے ہیں وہ کسی نہ کسی مصیبت اور پریشانی میں گرفتار

ہیں۔ جب دوبارہ حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ ہاں بتاؤ تم کس جیسا بننا چاہتے ہو؟ اس شخص نے جواب دیا کہ مجھے کوئی بھی شخص غم اور پریشانی سے خالی نظر نہیں آیا جس کے جیسا بننے کی دعا کراؤں۔ ------ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس دنیا میں کوئی بھی شخص تمہیں بے غم نظر نہیں آئے گا۔ البتہ میں تمہارے لئے یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عافیت کی زندگی عطا فرمائے۔

ہر شخص کو دولت الگ الگ دی گئی ہے

اس دنیا میں کوئی بھی شخص صدمے، غم اور تکلیف سے خالی ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ کسی کو کم تکلیف ہے، کسی کو زیادہ ہے، کسی کو کوئی تکلیف، کسی کو کوئی تکلیف۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ کسی کو کوئی دولت دے دی ہے اور کسی سے کوئی دولت لے لی ہے۔ کسی کو صحت کی دولت دے دی ہے لیکن روپیہ پیسہ کی دولت سے محروم ہے۔ کسی کو روپیہ پیسہ کی دولت حاصل ہے تو صحت کی دولت سے محروم ہے۔ کسی کے گھر کے حالات اچھے ہیں لیکن معاشی حالات خراب ہیں۔ کسی کے معاشی حالات اچھے ہیں لیکن گھر کی طرف سے پریشانی ہے۔ غرض ہر شخص کا اپنا الگ حال ہے۔ اور ہر شخص کسی نہ کسی تکلیف اور پریشانی میں گھرا ہوا ہے۔ لیکن اگر یہ پریشانی پہلی قسم سے ہے تو یہ اس کے لئے عذاب ہے اور اگر دوسری قسم سے ہے تو یہ اس کے لئے رحمت اور باعث اجر وثواب ہے۔

محبوب بندے پر پریشانی کیوں؟

ایک حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿اذا احب اللہ عبدا صب علیہ البلاء صبا﴾

یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو اس پر مختلف قسم کی

آزمائشیں اور تکالیف بھیجتے ہیں۔ وہ آزمائشیں اور تکالیف اس پر بارش کی طرح برستی ہیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ فرشتے پوچھتے ہیں کہ یا اللہ! یہ تو آپ کا محبوب بندہ ہے۔ نیک بندہ ہے، آپ سے محبت کرنے والا ہے، تو پھر اس بندے پر اتنی آزمائشیں اور تکالیف کیوں بھیجی جارہی ہیں؟ جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس بندے کو اسی حال میں رہنے دو، اس لئے کہ مجھے یہ بات پسند ہے کہ میں اس کی دعا کی اور اس کی گریہ وزاری اور آہ وبکا کی آواز سنوں۔ یہ حدیث اگرچہ سند کے اعتبار سے کمزور ہے لیکن اس معنی کی متعدد احادیث آئی ہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرے بندے کے پاس جاؤ اور اس کو آزمائش میں مبتلا کرو، اس لئے کہ میں اس کی آہ وبکا اور اس کی گریہ وزاری کی آواز سننا پسند کرتا ہوں۔ بات وہی ہے کہ دنیا میں تکالیف اور پریشانیاں تو آتی ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرا محبوب بندہ ہے، میں اس کے لئے تکلیف کو دائمی راحت کا ذریعہ بنانا چاہتا ہوں اور تاکہ اس کا درجہ بلند ہوجائے۔ اور جب آخرت میں میرے پاس پہنچے تو گناہوں سے بالکل پاک وصاف ہو کر پہنچے، اس لئے اپنے محبوب اور اپنے پیاروں کو تکالیف اور پریشانیاں عطا فرماتے ہیں۔

صبر کرنے والوں پر انعامات

اس کائنات میں انبیاء علیہم السلام سے زیادہ محبوب تو اللہ تعالیٰ کا کوئی اور ہو نہیں سکتا لیکن ان کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ:

﴿اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الأمثل فالأمثل﴾

یعنی اس دنیا میں سب سے زیادہ آزمائشیں انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں۔ پھر اس کے بعد جو شخص انبیاء علیہم السلام سے جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے اور جتنا تعلق رکھنے والا ہوتا ہے اس پر اتنی ہی آزمائشیں زیادہ آئیں گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھئے! جن کا لقب ہے "خلیل اللہ" اللہ کا دوست۔ لیکن ان پر بڑی بڑی بلائیں اور بڑی بڑی مصیبتیں آئیں۔ چنانچہ آگ میں ان کو ڈالا گیا۔ بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ان کو دیا گیا۔

بیوی بچے کو ایک بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑنے کا حکم ان کو دیا گیا۔ غرض کہ یہ بڑی بڑی آزمائشیں اُن پر آئیں۔ یہ تکالیف کیوں دی گئیں؟ تاکہ ان کے درجات بلند کئے جائیں۔ چنانچہ جب تکالیف پر قیامت کے روز اللہ تعالیٰ لوگوں کو انعام عطا فرمائیں گے تو اس وقت معلوم ہوگا کہ ان تکلیفوں کی پَرکاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں تھی اور وہ ان تکالیف کو بھول جائیں گے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تکالیف پر صبر کرنے والوں کو آخرت میں انعام عطا فرمائیں گے تو دوسرے لوگ ان انعامات کو دیکھ کر یہ تمنا کریں گے کہ کاش ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں اور اس پر ہم صبر کرتے تو آج ہم بھی ان انعامات کے مستحق ہوتے۔

تکالیف کی بہترین مثال

حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ ان تکالیف کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی کے جسم میں کوئی بیماری ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹر نے آپریشن کرنا تجویز کیا۔ اب مریض کو معلوم ہے کہ آپریشن میں چیڑ پھاڑ ہوگی، تکلیف ہوگی، لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر سے درخواست کرتا ہے کہ میرا آپریشن جلدی کردو، اور دوسروں سے سفارش بھی کرارہا ہے اور ڈاکٹر کو بھاری فیس بھی دے رہا ہے گویا کہ اس مقصد کے لئے پیسے دے رہا ہے کہ میرے اوپر نشتر چلاؤ۔ وہ یہ سب کچھ کیوں کررہا ہے؟ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ آپریشن کی اور نشتر چلانے کی تکلیف معمولی اور عارضی ہے۔ چند روز کے بعد زخم ٹھیک ہوجائے گا۔ لیکن اس آپریشن کے بعد جو صحت کی نعمت ملنے والی ہے وہ اتنی عظیم ہے کہ اس کے مقابلے میں یہ تکلیف کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اور جو ڈاکٹر چیڑ پھاڑ کررہا ہے اگرچہ بظاہر تکلیف دے رہا ہے لیکن اس مریض کے لئے اس وقت میں اس سے زیادہ مشفق اور محسن کوئی اور نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ڈاکٹر آپریشن کے ذریعہ اس کے لئے صحت کا سامان کررہا ہے۔

بالکل اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو تکلیف دیتے ہیں تو حقیقت میں اس کا

آپریشن ہو رہا ہے تاکہ اس کے ذریعہ ہم اس کو پاک وصاف کرلیں اور جب یہ بندہ ہمارے پاس آئے تو گناہوں سے پاک وصاف ہو کر اور ڈھل کر ہمارے پاس آئے۔

دوسری مثال

یا مثلاً تمہارا ایک محبوب ہے جس سے عرصہ دراز سے تمہاری ملاقات نہیں ہوئی اور اس سے ملنے کو دل چاہتا ہے۔ کسی موقع پر اچانک وہ محبوب تمہارے پاس آیا اور تمہیں پیچھے سے پکڑ کر زور سے دبانا شروع کردیا۔ اور اتنی زور سے دبایا کہ پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ اب یہ محبوب اس سے کہتا ہے کہ میں تمہارا فلاں محبوب ہوں، اگر میرے دبانے سے تمہیں تکلیف ہو رہی ہے تو چلو میں تمہیں چھوڑ کر کسی اور کو دبانا شروع کر دیتا ہوں تاکہ تمہاری یہ تکلیف دور ہو جائے۔ اگر یہ شخص اپنی مُحبّت کے دعوے میں سچا ہے تو اس وقت یہی کہے گا کہ تم اس سے زیادہ زور سے دبادو اور زیادہ تکلیف پہنچادو۔ اس لئے کہ میں تو مدتوں سے تمہاری ملاقات کا طالب تھا اور یہ شعر پڑھے گا کہ ۔

نہ نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کو یہ نصیب نہ ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہو جائیں۔ دوستوں کا سر سلامت ہے آپ اپنا خنجر اس پر آزمائیں۔

تکالیف پر "اناللہ" پڑھنے والے

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تکالیف آتی ہیں حقیقت میں ان بندوں کے درجات کی بلندی کے لئے آتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ولنبلونكم بشئى من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات، وبشر الصابرين ○ الذين اذا اصابتهم مصيبة قالوا انا لله وانا اليه راجعون اولئک عليهم صلوٰت من ربهم ورحمة واولئک هم المهتدون﴾

(وذکرها الملاعلی القاری فی المرقاة شرح المشکوة ص ۱۹۳ ج ۸)

"یعنی ہم تمہیں ضرور بالضرور آزمائیں گے، کبھی خوف سے آزمائیں گے، کبھی بھوک سے، کبھی تمہارے مالوں میں کمی ہوجائے گی، کبھی تمہارے اعزہ اور اقرباء میں اور ملنے جلنے والوں میں کمی ہوجائے گی، کبھی تمہارے پھلوں میں کمی ہوجائے گی۔ پھر آگے فرمایا کہ ان لوگوں کو خوشخبری سنادو جو ان مشکل ترین آزمائشوں پر صبر کریں اور یہ کہہ دیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت پر ہیں"۔

بہرحال، یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو بعض اوقات اس لئے تکلیفیں دیتے ہیں تاکہ ان کے درجات بلند فرمائیں۔

ہم دوست کو تکلیف دیتے ہیں

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ بعض اوقات بڑے وجد کے انداز میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

ما پروریم دشمن وما می کشیم دوست
کس را چوں وچرا نہ رسد در قضاء ما

یعنی بعض اوقات ہم اپنے دشمن کو پالتے ہیں اور اس کو دنیا کے اندر ترقی دیتے ہیں اور اپنے دوست کو تکلیف دیتے ہیں اور اس کو مارتے ہیں۔ ہماری قضا اور تقدیر میں

کسی کو چوں وچرا کی مجال نہیں۔ اس لئے کہ ہماری حکمتوں کو کون سمجھ سکتا ہے۔

ایک عجیب وغریب قِصّہ

حضرت حکیم الأمت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں ایک قِصّہ لکھا ہے کہ ایک شہر میں دو آدمی بسترِ مرگ پر تھے۔ مرنے کے قریب تھے۔ ایک مسلمان تھا اور ایک یہودی تھا۔ اس یہودی کے دل میں مچھلی کھانے کی خواہش پیدا ہوئی اور مچھلی قریب میں کہیں ملتی نہیں تھی۔ اور اس مسلمان کے دل میں روغن زیتون کھانے کی خواہش پیدا ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو بلایا۔ ایک فرشتے سے فرمایا کہ فلاں شہر میں ایک یہودی مرنے کے قریب ہے اور اس کا دل مچھلی کھانے کو چاہ رہا ہے۔ تم ایسا کرو کہ ایک مچھلی لے کر اس کے گھر کے تالاب میں ڈال دو تاکہ وہ مچھلی کھا کر اپنی خواہش پوری کرلے۔ دوسرے فرشتے سے فرمایا کہ فلاں شہر میں ایک مسلمان مرنے کے قریب ہے اور اس کا روغن زیتون کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ اور روغن زیتون اس کی الماری کے اندر موجود ہے۔ تم جاؤ اور اس کا روغن نکال کر ضائع کردو تاکہ وہ اپنی خواہش پوری نہ کرسکے۔ چنانچہ دونوں فرشتے اپنے اپنے مشن پر چلے، راستے میں ان دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ تم کس کام پر جارہے ہو؟ ایک فرشتے نے بتایا کہ میں فلاں یہودی کو مچھلی کھلانے جارہا ہوں۔ دوسرے فرشتے نے کہا کہ میں فلاں مسلمان کا روغن زیتون ضائع کرنے جارہا ہوں۔ دونوں کو تعجب ہوا کہ ہم دونوں کو دو متضاد کاموں کا حکم کیوں دیا گیا؟ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا اس لئے دونوں نے جاکر اپنا اپنا کام پورا کرلیا۔

جب واپس آئے تو دونوں نے عرض کیا کہ یا اللہ! ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل تو کرلی لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک مسلمان جو آپ کے حکم کو ماننے والا تھا اور اس کے پاس روغن زیتون موجود تھا۔ اس کے باوجود آپ نے اس کا روغن زیتون ضائع کرادیا۔ اور دوسری طرف ایک یہودی تھا اور اس کے پاس مچھلی موجود بھی

نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے اس کو مچھلی کھلادی؟ اس لئے ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا قصہ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ تم کو ہمارے کاموں کی حکمتوں کا پتہ نہیں ہے، بات دراصل یہ ہے کہ ہمارا معاملہ کافروں کے ساتھ کچھ اور ہے اور مسلمانوں کے ساتھ کچھ اور ہے۔ کافروں کے ساتھ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ چونکہ کافر بھی دنیا میں نیک اعمال کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً کبھی صدقہ خیرات کردیا۔ کبھی کسی فقیر کی مدد کردی۔ اس کے یہ نیک اعمال اگرچہ آخرت میں ہمارے ہاں مقبول نہیں ہیں، لیکن ہم ان کے نیک اعمال کا حساب دنیا میں چکا دیتے ہیں تاکہ جب یہ آخرت میں ہمارے پاس آئیں تو ان کے نیک اعمال کا حساب چکا ہوا ہو اور ہمارے ذمے ان کی کسی نیکی کا بدلہ باقی نہ ہو۔ اور مسلمانوں کے ساتھ ہمارا معاملہ جدا ہے۔ وہ یہ کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے گناہوں کا حساب دنیا کے اندر ہی چکا دیں تاکہ جب یہ ہمارے پاس آئیں تو گناہوں سے پاک وصاف ہو کر آئیں۔

لہٰذا اس یہودی نے جتنے نیک اعمال کئے تھے ان سب کا بدلہ ہم نے دے دیا تھا، صرف ایک نیکی کا بدلہ دینا باقی تھا۔ اور اب یہ ہمارے پاس آرہا تھا۔ جب اس کے دل میں مچھلی کھانے کی خواہش پیدا ہوئی تو ہم نے اُس کی اِس خواہش کو پورا کرتے ہوئے اس کو مچھلی کھلادی تاکہ جب یہ ہمارے پاس آئے تو اس کی نیکیوں کا حساب چکا ہوا ہو۔ اور اس مسلمان کی بیماری کے دوران باقی سارے گناہ تو معاف ہو چکے تھے البتہ ایک گناہ اس کے سر پر باقی تھا۔ اور اب یہ ہمارے پاس آنے والا تھا۔ اگر اسی حالت میں ہمارے پاس آجاتا تو اس کا یہ گناہ اس کے نامۂ اعمال میں ہوتا۔ اس لئے ہم نے یہ چاہا کہ اس کا روغن زیتون ضائع کرکے اور اس کی خواہش کو توڑ کر اس کے دل پر ایک چوٹ اور لگائیں اور اس کے ذریعہ اس کے ایک گناہ کو بھی صاف کردیں۔ تاکہ جب یہ ہمارے پاس آئے تو بالکل پاک وصاف ہو کر آئے۔ بہرحال، اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا کون ادراک کرسکتا ہے۔ کیا ہماری یہ چھوٹی سی عقل ان حکمتوں کا احاطہ کرسکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے تحت کائنات کا یہ نظام چل رہا ہے۔ ان کی حکمتیں اس کائنات میں متصرف

ہیں۔ انسان کے بس کا کام نہیں کہ وہ ان کا ادراک بھی کر سکے۔ ہمیں کیا معلوم کہ کون سے وقت میں اللہ تعالیٰ کی کون سی حکمت جاری ہے۔

یہ تکالیف اضطراری مجاہدات ہیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ پہلے زمانے میں لوگ جب اپنی اصلاح کرنے کے لئے کسی شیخ یا کسی بزرگ کے پاس جاتے تو وہ بزرگ اور شیخ ان سے بہت سے مجاہدات اور ریاضتیں کرایا کرتے تھے۔ یہ مجاہدات اختیاری ہوتے تھے۔ اب اس موجودہ دور میں وہ بڑے بڑے مجاہدات نہیں کرائے جاتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان بندوں کو مجاہدات سے محروم نہیں فرمایا، بلکہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے بندوں سے اضطراری اور زبردستی مجاہدہ کرایا جاتا ہے۔ اور ان اضطراری مجاہدات کے ذریعہ انسان کو جو ترقی ہوتی ہے وہ اختیاری مجاہدات کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتاری سے ہوتی ہے ------ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگی میں اختیاری مجاہدات اتنے نہیں تھے۔ مثلاً ان کے یہاں یہ نہیں تھا کہ جان بوجھ کر فاقہ کیا جارہا ہے۔ یا جان بوجھ کر تکلیف دی جارہی ہے وغیرہ۔ لیکن ان کی زندگی میں اضطراری مجاہدات بے شمار تھے۔ چنانچہ کلمہ طیبہ پڑھنے کی پاداش میں ان کو تپتی ہوئی ریت پر لٹایا جاتا تھا، سینے پر پتھر کی سلیں رکھی جاتی تھیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کی پاداش میں ان پر نہ جانے کیسے کیسے ظلم کئے جاتے تھے، یہ سب مجاہدات اضطراری تھے۔ اور ان اضطراری مجاہدات کے نتیجے میں صحابہ کرام کے درجات اتنے بلند ہوگئے کہ اب کوئی غیر صحابی ان کے مقام کو چھو نہیں سکتا ------ اس لئے فرمایا کہ اضطراری مجاہدات سے درجات زیادہ تیز رفتاری سے بلند ہوتے ہیں۔ اور انسان تیز رفتاری سے ترقی کرتا ہے۔ لہٰذا انسان کو جو تکالیف، پریشانیاں اور بیماریاں آرہی ہیں۔ یہ سب اضطراری مجاہدات کرائے جارہے ہیں۔ اور جس کو ہم تکلیف سمجھ رہے ہیں۔ حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور محبّت کا عنوان ہوتی

ہے۔

ان تکالیف کی تیسری مثال

مثلاً ایک چھوٹا بچہ ہے، وہ نہانے اور ہاتھ منہ دُھلوانے سے گھبراتا ہے۔ اور اس کو نہانے سے تکلیف ہوتی ہے، لیکن ماں زبردستی پکڑ کر اس کو نہلا دیتی ہے۔ اور اس کا میل کچیل دور کردیتی ہے۔ اب نہانے کے دوران وہ روتا بھی ہے۔ چیختا چلاتا بھی ہے، اس کے باوجود ماں اس کو نہیں چھوڑتی ہے ----- اب وہ بچہ تو یہ سمجھ رہا ہے کہ مجھ پر ظلم اور زیادتی ہو رہی ہے۔ مجھے تکلیف پہنچائی جارہی ہے۔ لیکن ماں شفقت اور مُحبّت کی وجہ سے بچے کو نہلا رہی ہے۔ اور اس کا میل کچیل دور کررہی ہے۔ اور اس کا جسم صاف کررہی ہے ------ چنانچہ جب وہ بچہ بڑا ہوگا، اس وقت اس کی سمجھ میں آئے گا کہ یہ نہلانے دُھلانے کا جو کام میری ماں کرتی تھی۔ وہ بڑی مُحبّت اور شفقت کا عمل تھا، جس کو میں ظلم اور زیادتی سمجھ رہا تھا۔ اگر میری ماں میرا میل کچیل دور نہ کرتی تو میں گندہ رہ جاتا۔

چوتھی مثال

یا مثلاً ایک بچے کو ماں باپ نے اسکول میں داخل کردیا، اب روزانہ صبح کو ماں باپ زبردستی اس کو اسکول بھیج دیتے ہیں۔ اسکول جاتے وقت وہ بچہ روتا چیختا ہے۔ چلاتا ہے، اور اسکول میں چار پانچ گھنٹے بیٹھنے کو اپنے لئے قید سمجھتا ہے۔ لیکن بچے کے ساتھ مُحبّت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو زبردستی اسکول بھیجیں۔ چنانچہ جب وہ بچہ بڑا ہوگا تب اس کی سمجھ میں آئے گا کہ اگر بچپن میں ماں باپ زبردستی مجھے اسکول نہ بھیجتے اور مجھے نہ پڑھاتے تو آج میں پڑھے لکھوں کی صف میں شامل نہ ہوتا۔ بلکہ جاہل رہ جاتا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر جو تکالیف اور پریشانیاں آتی ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مُحبّت اور شفقت کا عین تقاضہ ہے۔ اور انسان کے درجات بلند کرنے کے

لئے اس کو یہ تکالیف دی جارہی ہیں۔ بشرطیکہ ان تکالیف میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق ہوجائے تو پھر سمجھ لو کہ یہ تکالیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہی رحمت ہیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام اور تکالیف

حضرت ایوب علیہ السلام کو دیکھئے۔ کیسی سخت بیماری کے اندر مبتلا ہوئے کہ اس بیماری کے تصور کرنے سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، اور پھر اس بیماری کے اندر شیطان ان کے پاس آیا اور اس نے آپ کو تکلیف دینے کے لئے یہ کہنا شروع کردیا کہ آپ کے گناہوں کی وجہ سے یہ بیماری آئی ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہیں۔ اس لئے آپ کو اس تکلیف کے اندر مبتلا کردیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور قہر کی وجہ سے آپ کو یہ تکالیف آرہی ہیں۔ اور اس پر اس نے اپنے دلائل بھی پیش کئے۔ اس موقع پر حضرت ایوب علیہ السلام نے شیطان سے مناظرہ کیا، بائبل کے صحیفہ ایوبی میں اب بھی اس مناظرے کے بارے میں کچھ تفصیل موجود ہے۔ چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام نے شیطان کے جواب میں فرمایا کہ تمہاری بات درست نہیں کہ یہ بیماری اور تکالیف میرے گناہوں کی وجہ سے اللہ کے غضب اور قہر کے طور پر آئی ہے۔ بلکہ یہ تکالیف میرے خالق اور میرے مالک کی طرف سے محبّت کا عنوان ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور شفقت کی وجہ سے یہ تکالیف دے رہے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا تو ضرور مانگتا ہوں کہ یا اللہ مجھے اس بیماری سے شفا عطا فرمادیجئے۔ لیکن مجھے اللہ تعالیٰ سے اس بیماری پر گلہ اور شکوہ نہیں ہے اور مجھے اس بیماری پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ بیماری کیوں دی ہے؟ اور الحمدللہ، روزانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اور یہ دعا کرتا ہوں کہ:

﴿رب انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین﴾

"اے اللہ! مجھے یہ تکلیف ہے، آپ ارحم الراحمین ہیں۔ اس

تکلیف کو دور فرما دیجئے"۔

لہٰذا یہ میرا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا بھی ان کی طرف سے عطا ہے اور جب وہ مجھے اس تکلیف کے دوران اپنی بارگاہ میں رجوع کرنے کی توفیق دے رہے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ تکلیف بھی ان کی طرف سے رحمت اور محبّت کا ایک عنوان ہے ------ یہ ساری باتیں "صحیفہ ایوبی" میں موجود ہیں۔

تکالیف کے رحمت ہونے کی علامات

اس میں حضرت ایوب علیہ السلام نے اس کی علامات بتادیں کہ کون سی تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے قہر اور عذاب ہوتی ہے اور کون سی تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور انعام ہوتی ہے۔ وہ علامت یہ ہے کہ پہلی قسم کی تکلیف میں انسان اللہ تعالیٰ سے گلہ شکوہ کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتا، اور دوسری قسم کی تکلیف میں اللہ تعالیٰ سے گلہ شکوہ کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن دعا کرتا ہے کہ یا اللہ، میں کمزور ہوں اور اس تکلیف اور آزمائش کا متحمل نہیں ہوں۔ اپنی رحمت سے مجھے اس تکلیف اور آزمائش سے نکال دیجئے ------ لہٰذا جب کبھی صدمے کے وقت، تکلیف اور پریشانی کے وقت، بیماری میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق ہو جائے تو سمجھ لو کہ الحمدللہ یہ بیماری یہ پریشانی، یہ تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے، اس صورت میں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ تکلیف بالآخر انشاء اللہ دنیا اور آخرت میں تمہارے لئے خیر کا ذریعہ بنے گی۔ بس شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کی توفیق ہو جائے۔ اس لئے کہ اگر یہ تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے قہر اور غضب ہوتا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ اس تکلیف کے اندر اپنا نام لینے اور اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق ہی نہ دیتے۔ جب وہ اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق دے رہے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ تکلیف ان کی طرف سے رحمت ہے۔

دعا کی قبولیت کی علامت

البتہ یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات جب تکلیف کے اندر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ تکلیف اور پریشانی نہیں جاتی اور دعا قبول نہیں ہوتی ------ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرنے اور عرض معروض پیش کرنے کی توفیق مل جانا ہی اس بات کی علامت ہے کہ ہماری دعا قبول ہو گئی۔ ورنہ دعا کرنے کی بھی توفیق نہ ملتی۔ اور اب اس صورت میں تکلیف پر الگ انعام ملے گا، اور اس دعا کرنے پر الگ انعام حاصل ہوگا، اور اس دعا کے بعد دوبارہ دعا کرنے کی جو توفیق ہوگی، اس پر الگ انعام ملے گا۔ لہٰذا یہ تکلیف رفع درجات کا ذریعہ بن رہی ہے۔ اسی کے بارے میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

﴿ گفت آں "اللہ" تو لبیک ماست ﴾

یعنی جس وقت تو ہمارا نام لیتا ہے اور "اللہ" کہتا ہے تو یہ تیرا "اللہ" کہنا ہی ہماری طرف سے "لبیک" کہنا ہے، اور تمہارا اللہ کہنا ہی اس بات کی علامت ہے کہ ہم نے تمہاری پکار کو سن لیا اور اس کو قبول بھی کر لیا۔ لہٰذا دعا کی توفیق ہو جانا ہی ہماری طرف سے دعا کی قبولیت کی علامت ہے۔ البتہ یہ ہماری حکمت کا تقاضہ ہے کہ کب اس پریشانی کو تم سے دور کرنا ہے اور کب تک اس کو باقی رکھنا ہے۔ تم جلد باز ہو، اس لئے جلدی اس تکلیف کو دور کرانا چاہتے ہو، لیکن اگر اس تکلیف کو کچھ دیر کے بعد دور کیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں تمہارے درجات بہت زیادہ بلند ہو جائیں گے۔ لہٰذا تکلیف میں یہ گلہ شکوہ نہیں ہونا چاہئے۔ البتہ یہ دعا ضرور کرنی چاہئے کہ یا اللہ، میں کمزور ہوں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ مجھ سے یہ تکلیف دور فرما دیجئے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کا ایک واقعہ

تکلیف مانگنے کی چیز نہیں کہ آدمی یہ دعا کرے کہ یا اللہ، مجھے تکلیف دے دیں۔ لیکن جب تکلیف آجائے تو وہ صبر کرنے کی چیز ہے۔ اور صبر کا مطلب یہ ہے کہ اس پر گلہ شکوہ نہ کرے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تکالیف سے پناہ مانگی ہے۔ ایک دعا میں آپ نے فرمایا: یا اللہ، میں آپ سے بُری بُری بیماریوں سے اور بُرے بُرے امراض سے پناہ مانگتا ہوں۔ لیکن جب کبھی تکلیف آگئی تو اس کو اپنے حق میں بھی رحمت سمجھا، اور اس کے ازالے کی بھی دعا مانگی ------ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں یہ قِصّہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مجلس میں یہ مضمون بیان فرمارہے تھے کہ جتنی تکالیف ہوتی ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور انعام ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ وہ بندہ اس کی قدر پہچانے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ اس بیان کے دوران ایک شخص مجلس میں آیا، جو کوڑھ کا مریض تھا، اور اس بیماری کی وجہ سے اس کا سارا جسم گلا ہوا تھا۔ مجلس میں آکر حضرت حاجی صاحب سے کہا کہ حضرت، دعا فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری یہ تکلیف دور فرمادے ------ حاضرین یہ سوچنے لگے کہ ابھی تو حضرت یہ بیان فرمارہے تھے کہ جتنی تکالیف ہوتی ہیں۔ وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام اور رحمت ہوتی ہیں۔ اور یہ شخص اس بیماری کے ازالے کی دعا کرا رہا ہے۔ اب کیا حضرت حاجی صاحبؒ یہ دعا فرمائیں گے کہ یا اللہ اس رحمت کو دور کردیجئے؟ ------ حضرت حاجی صاحب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: یا اللہ، یہ بیماری اور تکلیف جو اس بندے کو ہے، اگرچہ یہ بھی آپ کی رحمت کا عنوان ہے۔ لیکن ہم اپنی کمزوری کی وجہ سے اس رحمت اور نعمت کے متحمل نہیں ہیں۔ لہٰذا اے اللہ اس بیماری کی نعمت کو صحت کی نعمت سے تبدیل فرمادیجئے ------ یہ ہے دین کی فہم جو بزرگوں کی صحبت سے حاصل کی جاتی ہے۔

خلاصہ حدیث

بہرحال، اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو اس کو کسی آزمائش میں مبتلا فرما دیتے ہیں۔ اور یہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بندے کا رونا اور اس کا پکارنا، اور اس کا گریہ وزاری کرنا ہمیں اچھا لگتا ہے۔ اس لئے ہم اس کو تکلیف دے رہے ہیں، تاکہ یہ اس تکلیف کے اندر ہمیں پکارے۔ اور پھر ہم اس پکار کے نتیجے میں اس کے درجات بلند کریں۔ اور اس کو اعلیٰ مقام تک پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بیماری اور تکلیف سے اپنی پناہ میں رکھے۔ اور اگر تکلیف آئے تو اس پر صبر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس تکلیف میں اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

تکالیف میں عاجزی کا اظہار کرنا چاہئے

بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ وہ تکلیف میں ہائے ہائے کرتے تھے، اور اس تکلیف کا اظہار کرتے تھے۔ اب بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تکلیف پر ہائے ہائے کرنا اور اس تکلیف کا اظہار کرنا تو بے صبری ہے، اور اس تکلیف پر شکوہ ہے کہ ہمیں یہ تکلیف کیوں دی گئی اور تکلیف پر بے صبری یا شکوہ کرنا درست نہیں، ------ اس کا جواب بھی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو اللہ کے نیک اور مقبول بندے ہوتے ہیں وہ شکایت کی وجہ سے تکلیف کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے تکلیف اسی وجہ سے دی گئی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی شکستگی اور بندگی کا اظہار کروں، اور اپنی عاجزی کا اظہار کروں اور اس تکلیف پر ہائے ہائے بھی کروں۔ یہ تکلیف مجھے اسی لئے دی گئی ہے کہ میری آہیں سننا مقصود ہے۔ میری گریہ وزاری سننا مقصود ہے۔ اس لئے اس موقع پر بہادری کا مظاہرہ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک مرتبہ ایک بزرگ بیمار پڑ گئے، ایک دوسرے بزرگ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ انہوں نے جاکر دیکھا کہ وہ بیمار بزرگ "الحمدللہ، الحمدللہ" کا ورد کر رہے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ آپ کا یہ عمل تو بہت اچھا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے ہیں، لیکن اس موقع پر تھوڑی سی ہائے ہائے بھی کرو۔ اور جب تک ہائے ہائے نہیں کرو گے، شفا نہیں ہوگی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ تکلیف اس لئے دی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری بھی کریں اور بندگی کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادر نہ بنے، بلکہ شکستگی اور کمزوری کا اظہار کرے، اور یہ کہے کہ یا اللہ، میں عاجز اور کمزور ہوں، اس بیماری کا متحمل نہیں ہوں۔ میری یہ بیماری دور فرما دیجئے ------ میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی صاحب مرحوم، بڑے اچھے شعر کہا کرتے تھے، ایک شعر میں انہوں نے اس مضمون کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ ؎

اس قدر بھی ضبط غم اچھا نہیں
توڑنا ہے حسن کا پندار کیا

یعنی جب اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی تکلیف دے رہے ہیں تو اس تکلیف پر اس قدر ضبط کرنا کہ آدمی کے منہ سے آہ بھی نہ نکلے اور تکلیف کا ذرہ برابر بھی اظہار نہ ہو، یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں۔ کیا اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری دکھانا مقصود ہے کہ آپ کو جو کرنا ہے کرلیں۔ ہم تو ویسے کے ویسے ہی رہیں گے ------ العیاذ باللہ ------ اس لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کا اظہار کرنا چاہئے۔

ایک عبرت آموز واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی حال میں ان کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا۔ جس میں اللہ تعالیٰ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ۔

لیس لی فی سواک حظ
فکیف ماشئت فاختبرنی

اے اللہ، آپ کے علاوہ مجھے کسی کی ذات میں کسی کام میں کوئی مزہ نہیں ہے۔ آپ جس طرح چاہیں۔ مجھے آزما کر دیکھ لیں ------ العیاذ باللہ ------ گویا کہ اللہ تعالیٰ کو آزمانے کی دعوت دے دی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا پیشاب بند ہوگیا، اب مثانہ پیشاب سے بھرا ہوا ہے، لیکن خارج ہونے کا راستہ نہیں۔ کئی دن اس حالت میں گزر گئے۔ بالآخر متنبہ ہوا کہ کتنی غلط بات میرے منہ سے نکل گئی تھی، ان بزرگ کے پاس چھوٹے چھوٹے بچے پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ اس حالت میں وہ ان بچوں سے کہتے کہ ادعولعمکم الکذاب اپنے جھوٹے چچا کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ مجھے اس بیماری سے نکال دے۔ اس لئے کہ اس نے جھوٹا دعویٰ کردیا تھا------ اللہ تعالیٰ نے دکھادیا کہ تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ کسی چیز میں کوئی مزہ نہیں ہے۔ ارے تم کو تو پیشاب کے اندر مزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری نہیں چلا کرتی۔

تکالیف میں حضور ﷺ کا طریقہ

لہٰذا نہ تو تکلیف پر شکوہ ہو، اور نہ تکلیف پر بہادری کا اظہار ہو۔ بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال اور سُنّت کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب مرض وفات کی تکلیف میں تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس موقع پر آپ بار بار اپنا دست مبارک پانی میں بھگوتے اور چہرے پر ملتے تھے اور اس

تکلیف کا اظہار فرماتے۔ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس موقع پر فرمایا: واکرب اباہ میرے والد کو کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاکرب ابیک بعد الیوم آج کے دن کے بعد تیرے باپ پر کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ دیکھئے اس میں آپ نے اس تکلیف کا اظہار فرمایا۔ لیکن شکوہ نہیں فرمایا۔ بلکہ اگلی منزل کے راحت و آرام کی طرف اشارہ فرمادیا۔ یہ ہے سُنّت طریقہ۔

جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون﴾

اے ابراہیم ہمیں تمہاری جدائی پر بڑا صدمہ ہے۔------ آپ کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بچہ آپ کی گود میں ہے۔ آپ کی گود میں اس کی جان نکل رہی ہے، آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اس میں اظہار عبدیت اور اظہار بندگی ہے کہ اے اللہ، فیصلہ تو آپ کا برحق ہے۔ لیکن آپ نے یہ تکلیف اسی لئے دی ہے کہ میں آپ کے سامنے عاجزی کا اظہار کروں اور آنسو بہاؤں، گریہ وزاری کروں۔

لہٰذا سُنّت یہ ہے کہ گلہ شکوہ بھی نہ ہو اور بہادری کا اظہار بھی نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر یہ کہے کہ یا اللہ۔ میری اس تکلیف کو دور فرمادے۔ یہی مسنون طریقہ ہے اور یہی اس حدیث کا مفہوم ہے اللہ تعالیٰ اس کی صحیح فہم ہم کو عطا فرمائے۔ اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حلال روزگار نہ چھوڑیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۱۷ر مئی ۱۹۹۶ء

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حلال روزگار نہ چھوڑیں

الحمد للّٰہ نحمده ونستعینه ونستغفره ونؤمن به ونتوکل علیه ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئآت اعمالنا من یهده اللّٰہ فلا مضل له ومن یضلله فلا هادی له ونشهد ان لاإله إلا اللّٰہ وحده لاشریك له واشهد ان سیدناونبینا ومولانا محمداً عبده وسوله. صلی اللّٰہ تعالی علیه وعلی آله وأصحابه وبارك وسلّم تسلیمًا کثیرًا کثیرًا۔

امّا بعد :-

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلّم : من رزق فی شیئ فَلْیلزمه. من جُعِلَت معیشة فی شئ فلا ینتقل عنه حتی یتغیر علیه-

(کنزالعمال حدیث نمبر ۹۲۸٦__ اتحاف السادۃ المتقین ٤ : ۲۸۷)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ : جس شخص کو جس کام کے ذریعہ رزق مل رہا ہو' اسکو چاہئے کہ وہ اس کام میں لگا رہے' اپنے اختیار اور مرضی سے بلاوجہ اسکو نہ چھوڑے اور جس شخص کا روزگار اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہو تو وہ شخص اس روزگار کو چھوڑ کر دوسری طرف منتقل نہ ہو۔ جب تک کہ وہ روزگار خود سے بدل جائے یا اس روزگار میں خود سے ناموافقت پیدا ہو جائے۔

رزق کا ذریعہ منجانب اللہ ہے۔

جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے کسی شخص کے لئے حصول رزق کا ایک ذریعہ مقرر فرما دیا' وہ شخص اس میں لگا ہوا ہے اور اس کے ذریعہ اسکو رزق مل رہا ہے تو اب بلاوجہ اس روزگار کو چھوڑ کر الگ نہ ہو' بلکہ اس میں لگا رہے' تاوقتیکہ وہ خود اسکے ہاتھ سے نکل جائے یا ایسی ناموافقت پیدا ہو جائے کہ اب آئندہ اس کو جاری رکھنا پریشانی کا سبب ہو گا۔ اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی ذریعہ سے رزق وابستہ کر دیا ہے تو یہ اللہ جل شانہ کی عطا ہے' اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو اس کام میں لگایا گیا ہے اور اس سے وابستہ کیا گیا ہے' کیونکہ ویسے تو رزق کے حصول کے ہزاروں راستے اور طریقے ہیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے لئے کسی خاص طریقے کو رزق حاصل کرنے کا سبب بنا دیا تو یہ منجانب اللہ ہے' اب اس منجانب اللہ طریقے کو اپنی طرف سے بلاوجہ نہ چھوڑے۔

روزگار اور معیشت کا نظام خداوندی

دیکھئے: اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں روزگار اور معیشت کا ایک عجیب نظام بنایا ہے جس کو ہماری عقل نہیں پہنچ سکتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾

(الزخرف: ۳۲)

یعنی ہم نے دنیاوی زندگی میں ان کی معیشت تقسیم کی ہے۔ وہ اس طرح کہ کسی انسان کے دل میں حاجت پیدا کی اور دوسرے انسان کے دل میں اس حاجت کو پورا کرنے کا طریقہ ڈال دیا۔ ذرا غور کریں کہ انسان کی حاجتیں اور ضرورتیں کتنی ہیں؟ روٹی کی اسے ضرورت ہے، کپڑے کی اسے ضرورت ہے۔ مکان کی اسے ضرورت ہے، گھر کا سازو سامان اور برتنوں کی اسے ضرورت ہے، گویا کہ انسان کو زندگی گزارنے کے لئے بے شمار اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا پوری دنیا کے انسانوں نے مل کر کوئی کانفرنس کی تھی اور اس کانفرنس میں انسان کو پیش آنے والی ضروریات کو شمار کیا تھا۔ اور پھر آپس میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ اتنے لوگ کپڑا بنائیں، اتنے انسان برتن بنائیں۔ اتنے انسان جوتے بنائیں، اتنے انسان گندم پیدا کریں اور اتنے انسان چاول پیدا کریں وغیرہ۔ اگر تمام انسان ملکر کانفرنس کر کے یہ طے کرنا چاہتے تب بھی یہ انسان کے بس میں نہیں تھا کہ وہ انسانوں کی تمام ضروریات کا احاطہ کر لیں، اور پھر آپس میں تقسیم کار بھی کریں کہ تم یہ کام کرنا، تم فلاں چیز کی دکان کرنا اور تم فلاں چیز کی دوکان کرنا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا قائم کیا ہوا نظام ہے کہ اس نے ایک انسان کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم گندم اگاؤ۔ دوسرے انسان کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم آٹے کی چکی لگاؤ۔ ایک کے دل میں یہ ڈال دیا کہ

چاول پیدا کرو۔ ایک انسان کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم گھی کی دکان لگاؤ۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے دل میں ان حاجات کو ڈال دیا جو تمام انسانوں کی حاجتیں ہیں' چنانچہ جب آپ کسی ضرورت کو پورا کرنا چاہیں اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے آپ کے پاس پیسے بھی ہوں تو بازار میں آپ کی وہ حاجت انشاء اللہ ضرور پوری ہو جائیگی۔

تقسیم رزق کا حیرت ناک واقعہ

میرے بڑے بھائی جناب زکی کیفی صاحب' اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے۔ ایک دن انہوں نے فرمایا کہ تجارت میں بعض اوقات اللہ تعالیٰ ایسے ایسے منظر دکھاتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور رزاقیت کے آگے سجدہ ریز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لاہور میں ان کی دینی کتابوں کی دکان "ادارہ اسلامیات" کے نام سے ہے۔ وہاں بیٹھا کرتے تھے۔ فرمایا کہ ایک دن جب میں نے صبح کو گھر سے دکان جانے کا ارادہ کیا تو دیکھا کہ شدید بارش شروع ہو گئی۔ اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ ایسی شدید بارش ہو رہی ہے' اس وقت سارا نظام زندگی تلپٹ ہے' ایسے میں دکان جا کر کیا کرونگا؟ کتاب خریدنے کے لئے کون دکان پر آئیگا۔ اس لئے کہ ایسے وقت میں اول تو لوگ گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر نکلتے بھی ہیں تو شدید ضرورت کے لئے نکلتے ہیں' کتاب اور خاص طور پر دینی کتاب تو ایسی چیز ہے کہ جس سے نہ تو بھوک مٹ سکتی ہے' نہ کوئی دوسری ضرورت پوری ہو سکتی ہے' اور جب انسان کی دنیاوی تمام ضروریات پوری ہو جائیں تو اس کے بعد کتاب کا خیال آتا ہے' لہذا ایسے میں کون گاہک کتاب خریدنے آئیگا؟ اور میں دکان پر جا کر کیا کرونگا؟ لیکن ساتھ ہی دل میں یہ خیال آیا

کہ میں نے تو اپنے روزگار کے لئے ایک طریقہ اختیار کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس طریقے کو میرے لئے رزق کے حصول کا ایک ذریعہ بنایا ہے' اسلئے میرا کام یہ ہے کہ میں جاکر دکان کھول کر بیٹھ جاؤں' چاہے کوئی گاہک آئے یا نہ آئے۔ بس میں نے چھتری اٹھائی اور دوکان کی طرف روانہ ہو گیا' جاکر دوکان کھولی اور قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی' اس خیال سے کہ گاہک تو کوئی آئیگا نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ لوگ اپنے اوپر برساتی ڈال کر آرہے ہیں اور کتابیں خرید رہے ہیں اور ایسی کتابیں خرید رہے ہیں کہ جن کی بظاہر وقتی ضرورت بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ چنانچہ جتنی بکری اور دونوں میں ہوتی تھی تقریباً اتنی ہی بکری اس بارش میں بھی ہوئی۔ میں سوچنے لگا کہ یا اللہ! اگر کوئی انسان عقل سے سوچے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس آندھی اور طوفان والی تیز بارش میں کون دینی کتاب خریدنے آئیگا؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ وہ جاکر کتاب خریدیں۔ اور میرے دل میں یہ ڈالا کہ تم جاکر دوکان کھولو۔ مجھے پیسوں کی ضرورت تھی اور ان کو کتاب کی ضرورت تھی۔ اور دونوں کو دکان پر جمع کر دیا۔ ان کو کتاب مل گئی مجھے پیسے مل گئے۔ یہ نظام صرف اللہ تعالیٰ بنا سکتے ہیں' کوئی شخص یہ چاہے کہ میں منصوبے کے ذریعہ اور کانفرنس کر کے یہ نظام بنا لوں؟ باہمی منصوبہ بندی کر کے بنا لوں تو کبھی ساری عمر نہیں بنا سکتا۔

رات کو سونے اور دن میں کام کرنے کا فطری نظام

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ذرا اس بات میں غور کرو کہ سارے انسان رات کے وقت سوتے ہیں اور دن کے وقت کام کرتے ہیں۔ اور رات کے وقت نیند آتی

ہے اور دن کے وقت نیند بھی نہیں آتی۔ تو کیا ساری دنیا کے انسانوں نے ملکر کوئی انٹر نیشنل کانفرنس کی تھی جس میں سب انسانوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ دن کے وقت کام کریں گے اور رات کے وقت سویا کریں گے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ رات کے وقت سو جاؤ اور دن کے وقت کام کرو۔

﴿وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا﴾

اگر یہ چیز انسان کے اختیار میں دے دی جاتی کہ وہ جب چاہے کام کرے اور جس وقت چاہے سو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کوئی شخص کہتا کہ میں دن کو سوؤں گا اور رات کو کام کرونگا،کوئی کہتا کہ میں شام کو سوؤں گا اور صبح کے وقت کام کرونگا' کوئی کہتا کہ میں صبح کے وقت سوؤنگا اور شام کے وقت کام کرونگا۔ پھر اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک وقت میں ایک شخص سونا چاہ رہا ہے اور دوسرا شخص اسی وقت کھٹ کھٹ کر رہا ہے اور اپنا کام کر رہا ہے' اور اسکی وجہ سے دوسرے کی نیند خراب ہوتی۔ اس طرح دنیا کا نظام خراب ہو جاتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہر انسان کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ دن کے وقت کام کرو اور رات کے وقت آرام کرو۔ اور اس کو فطرت کا ایک تقاضہ بنا دیا۔

رزق کا دروازہ بند مت کرو۔

بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی معیشت کا نظام بھی خود بنایا ہے اور ہر ایک کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم یہ کام کرو اور تم یہ کام کرو' لہٰذا جب تم کو کسی کام پر لگا دیا گیا اور تمہارا رزق ایک ذریعہ سے وابستہ کر دیا گیا تو یہ کام خود سے نہیں ہو گیا بلکہ کسی کرنے والے نے کیا' اور کسی

مصلحت سے کیا' لہٰذا اب بلاوجہ اس حلال ذریعہ رزق کو چھوڑ کر کوئی اور ذریعہ اختیار کرنے کی فکر مت کرو' کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اسی ذریعہ میں کوئی مصلحت رکھی ہو۔ اور تمہارے اس کام میں لگنے کی وجہ سے نہ جانے کتنے لوگوں کے کام نکل رہے ہوں' اور تم اس وقت پورے نظام معیشت کا ایک حصہ اور پرزہ بنے ہوئے ہو' اس لئے اپنی طرف سے اس ذریعہ کو مت چھوڑو' البتہ اگر کسی وجہ سے وہ ملازمت یا وہ تجارت خود ہی چھوٹ جائے یا اسکے اندر ناموافقت پیدا ہو جائے' مثلاً دکان پر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا ہے اور کوشش کے باوجود آمدنی بالکل نہیں ہو رہی ہے' تو اس صورت میں بیشک اس ذریعہ کو چھوڑ کر دوسرا ذریعہ اختیار کرلے۔ لیکن جب تک کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو' اس وقت تک خود سے رزق کا دروازہ بند نہ کرے۔

یہ عطاء خداوندی ہے۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمتہ اللہ علیہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ:

چیز یکہ بے طلب رسد آں دادہ خدا است
اورا تو رد مکن کہ فرستادہ خدا است

یعنی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی چیز طلب کے بغیر مل جائے تو اس کو منجانب اللہ سمجھ کر اس کو رد نہ کرو' کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے۔ بہرحال' اللہ تعالیٰ نے جس ذریعہ سے تمہارا رزق وابستہ کیا ہے اس سے لگے رہو' جب تک کہ خود ہی حالات نہ بدل جائیں۔

ہر معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

اس حدیث کے تحت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ:

> "اہل طریق نے اسی پر تمام معاملات کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کے ساتھ واقع ہوتے ہیں، قیاس کیا ہے، جن کی معرفت، بصیرت اور فراست خصوصاً واقعات سے ہو جاتی ہے، اس معرفت کے بعد وہ ان میں تغیر اور تبدل از خود نہیں کرتے، اور یہ امر قوم کے نزدیک مثل بدیہیات کے بلکہ مثل محسوسات کے ہے، جسکی وہ اپنے احوال میں رعایت رکھتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اس حدیث میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ اگرچہ براہ راست رزق سے متعلق ہے، لیکن صوفیاء کرام اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی نکالتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کے ساتھ جو بھی معاملہ کر رکھا ہے، مثلاً علم میں، خلق خدا کے ساتھ تعلقات میں، یا کسی اور چیز میں اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کر رکھا ہے، تو وہ شخص اس کو اپنی طرف سے بدلنے کی کوشش نہ کرے بلکہ اس پر قائم رہے۔

حضرت عثمان غنیؓ نے خلافت کیوں نہیں چھوڑی؟

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کا جو مشہور واقعہ ہے کہ ان کی خلافت کے آخری دور میں ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ اور اسکی وجہ بھی خود حضرت عثمان غنیؓ نے بیان فرمائی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک قمیص پہنائیں گے، اور تم اپنے

اختیار سے اس قمیص کو مت اتارنا' لہٰذا یہ خلافت جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہے' یہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خلافت کی قمیص پہنائی ہے' میں اپنے اختیار سے اس کو نہیں اتاروں گا۔ چنانچہ آپ نے نہ تو خلافت چھوڑی اور نہ ہی باغیوں کے خلاف تلوار اٹھائی' اور نہ ان کو قلع قمع کرنے کا حکم دیا۔ حالانکہ آپ امیرالمؤمنین اور خلیفہ وقت تھے' آپ کے پاس لشکر اور فوج تھی' آپ چاہتے تو باغیوں کے خلاف مقابلہ کر سکتے تھے' لیکن آپ نے فرمایا کہ چونکہ یہ باغی اور مجھ پر حملہ کرنے والے بھی مسلمان ہیں' اور میں نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانے والا پہلا شخص میں ہو جاؤں۔ چنانچہ آپ نے نہ تو خلافت چھوڑی اور نہ ہی باغیوں کا مقابلہ کیا' بلکہ اپنے گھر کے اندر ہی محصور ہو کر بیٹھ گئے' حتی کہ اپنی جان قربان کر دی اور جام شہادت نوش فرمایا۔ شہادت قبول کر لی لیکن خلافت نہیں چھوڑی۔ یہ وہی بات ہے جس کی طرف حضرت تھانویؒ نے اشارہ فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے ذمے ایک کام سپرد کر دیا تو اس میں لگے رہو' اپنی طرف سے اس کو مت چھوڑو۔

خدمتِ خلق کا منصب عطاء خداوندی ہے۔

بہر حال' اللہ تعالیٰ نے جب خدمت دین کا کوئی راستہ تمہارے لئے تجویز فرما دیا او وہ تمہار؛ طلب کے بغیر ملا ہے تو اب بلاوجہ اس کو ترک نہ کرے' اس کے لئے اسی میں نور اور برکت ہے۔ اسی طرح اہل طریق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے جتنے احوال اور معاملات ہوتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ ان احوال کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر قبول کر لیں' اسی طرح بعض اوقات کسی شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ ہوتا ہے' مثلاً ایک شخص کی طرف لوگ اپنی مدد اور اسکے تعاون کے لئے رجوع کرتے

ہیں' یا دین کے معاملات میں اسکی طرف رجوع کرتے ہیں' یا دنیاوی معاملات میں اس سے مشورہ لینے کے لئے رجوع کرتے ہیں' تو حقیقت میں یہ ایک ایسا منصب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمایا ہے' اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی لوگوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ آپس کے معاملات میں اس شخص سے مشورہ کرو' یا ضرورت کے موقع پر اس شخص سے مدد لو' اور جھگڑے ہوں تو اس شخص سے جاکر فیصلہ کراؤ۔ لوگوں کے دلوں میں یہ بات از خود پیدا نہیں ہوئی' بلکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں یہ باتیں ڈال دیں۔ تو یہ منصب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ملا ہے' اب اپنی طرف سے اس کو ختم نہ کرے' اسلئے کہ یہ منجانب اللہ ہے اور اس خدمت خلق کو منجانب اللہ سمجھ کر کرتا رہے۔

مثلاً بعض اوقات اللہ تعالیٰ خاندان میں سے کسی شخص کو یہ مقام اور منصب عطا فرما دیتے ہیں کہ جہاں خاندان میں کوئی جھگڑا ہوا یا کوئی اہم معاملہ کرنا ہے تو لوگ فوراً اس شخص کے پاس جاتے ہیں اور اس سے مشورہ کرتے ہیں۔ اب بعض اوقات وہ شخص اس بات سے گھبراتا ہے کہ دنیا کی ساری باتیں اور سارے جھگڑے میرے سر ڈالے جاتے ہیں۔ حقیقت میں یہ گھبرانے کی چیز نہیں ہے' اس لئے کہ لوگوں کا آپ کی طرف رجوع کرنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ منجانب اللہ لوگوں کے دلوں میں ڈالا گیا ہے کہ اسکی طرف رجوع کرو' اور یہ منصب منجانب اللہ عطا ہوا ہے۔

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو

لہٰذا اس منصب سے بے نیازی مت برتو' بلکہ اس کو خوشی سے قبول کرلو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں یہ خدمت سونپی گئی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ

حضرت ایوب علیہ السلام کو دیکھئے کہ ایک مرتبہ آپ غسل فرمار ہے تھے، غسل کے دوران آپ کے اوپر سونے کی تتلیاں گرنی شروع ہو گئیں، چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام نے غسل کرنا چھوڑ دیا۔ اور تتلیاں جمع کرنی شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ اے ایوب (علیہ السلام) کیا ہم نے تم کو غنی نہیں کیا، اور تمہیں مال و دولت نہیں دی؟ پھر بھی تم اس سونے کو جمع کرنے کی طرف دوڑ رہے ہو۔ جواب میں حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا کہ : یا اللہ! بیشک آپ نے اتنا مال و دولت عطا فرمایا ہے کہ میں اس کا شکر ادا نہیں کر سکتا، لیکن جو دولت آپ اپنی طرف سے میرے طلب کے بغیر عطا فرما رہے ہیں، اس سے میں کبھی بے نیازی کا اظہار بھی نہیں کر سکتا، آپ میرے اوپر سونے کی تتلیاں برسا رہے ہیں اور میں یہ کہدوں کہ مجھے ضرورت نہیں ہے، جب آپ دے رہے ہیں تو میرا کام یہ ہے کہ میں محتاج بن کر ان کی طرف جاؤں اور ان کو حاصل کروں۔

بات دراصل یہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی نظر میں وہ تتلیاں مقصود نہیں تھیں اور نہ وہ سونا مقصود تھا جو آسمان سے گر رہا تھا، بلکہ ان کی نظر اس دینے والی ذات پر تھی کہ کس ہاتھ سے یہ دولت مل رہی ہے، اور جب دینے والی ذات اتنی عظیم ہو تو انسان کو آگے بڑھ کر اور محتاج بن کر لینا چاہیے۔ ورنہ اس سونے کی طلب نہیں تھی۔

عیدی زیادہ طلب کرنے کا واقعہ

اس کی مثال میں یہ دیا کرتا ہوں کہ میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد

شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ سب اولادوں کو عید کے موقع پر عیدی دیا کرتے تھے، ہم سب بھائی ہر سال عید کے موقع پر جا کر ان سے مطالبہ کیا کرتے تھے کہ پچھلی عید پر آپ نے بیس روپے دیے تھے۔ اس سال گرانی میں اضافہ ہو گیا ہے لہٰذا اس سال پچیس روپے دیجئے۔ تو ہر سال بڑھا کر مانگتے کہ بیس کی جگہ پچیس، اور پچیس کی جگہ تیس روپے اور تیس کے پینتیس روپے مانگتے، جواب میں حضرت والد صاحبؒ فرماتے کہ تم چور ڈاکو لوگ ہو، اور ہر سال تم زیادہ مانگتے ہو، --- دیکھئے: اس وقت ہم سب بھائی برسر روزگار اور ہزاروں کمانے والے تھے، لیکن جب باپ کے پاس جاتے تو رغبت کا اظہار کر کے ان سے مانگتے، کیوں؟ بات در حقیقت یہ تھی کہ نظر ان پیسوں کی طرف نہیں تھی جو بیس، پچیس اور تیس روپے کی شکل میں مل رہے تھے، بلکہ نظر اس دینے والے ہاتھ کی طرف تھی کہ اس ہاتھ سے جو کچھ ملیگا، اس میں جو برکت اور نور ہو گا ہزاروں اور لاکھوں میں وہ برکت اور نور حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب دنیا کے معمولی تعلقات میں انسان کا یہ حال ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ جو احکم الحاکمین ہیں، ان کے ساتھ تعلق میں کیا حال ہو گا؟ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ سے مانگے تو محتاج بن کر مانگے، اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو تو محتاج بن کر اس کو لے لے۔ اس وقت بے نیازی اختیار نہ کرے۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں
خاک برفرق قناعت بعد ازیں

جب وہ یہ چاہ رہے ہیں کہ میں ان کے سامنے طمع ظاہر کروں تو ایسے میں قناعت کے سر پر خاک۔ اس وقت تو اس میں لذت اور مزہ ہے کہ آدمی لالچی بن کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر مانگے اور جو ملے اس کو قبول کر لے۔

لہٰذا جس کام پر اللہ تعالیٰ نے لگا دیا یا جو منصب اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دیا یہ ان کی طرف سے عطا ہے، اسکو اپنی طرف سے مت چھوڑو۔ ہاں اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں جن کی وجہ سے آدمی چھوڑنے پر مجبور ہو جائے یا کوئی اپنا بڑا کہہ دے، مثلاً چھوڑنے کے لئے کسی بڑے سے مشورہ کیا اور اس نے یہ کہہ دیا کہ اب تمہارے لئے اس کو چھوڑ دینا ہی مناسب ہے تو اس وقت اس کو چھوڑ دو۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی خاص طلب کے بغیر جو چیز ملے وہ منجانب اللہ ہے، اسکی ناقدری مت کرو۔

چیز یکہ بے طلب رسد آں دادہ خدا ست
او را تو رد مکن کہ فرستادہ خدا ست

وہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے اس کو رد مت کرو۔ اللہ تعالیٰ بچائے! بعض اوقات اس رد کرنے اور بے نیازی کا اظہار کرنے سے انجام بہت خراب ہو جاتا ہے، العیاذ باللہ۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وبال آجاتا ہے۔ لہٰذا جو چیز طلب کے بغیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آجائے یا ایسے خدا ساز اسباب کے ذریعہ یعنی ایسے اسباب کے ذریعہ کوئی چیز مل گئی جس کا پہلے وہم و گمان بھی نہیں تھا، بشرطیکہ وہ حلال اور جائز ہو تو منجانب اللہ سمجھ کر اس کو قبول کر لینا چاہیے۔ اسی طرح جس خدمت پر اللہ تعالیٰ کسی کو لگا دے تو اس کو اس خدمت پر لگا رہنا چاہیے، اس خدمت سے اپنے طور پر دست بردار ہونے کی کوشش نہ کرے، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس خدمت پر لگا دیا ہے اور تم سے وہ خدمت لے رہے ہیں۔ اسی طرح اگر تمہیں اللہ تعالیٰ نے تمہاری طلب کے بغیر کوئی مقام اور منصب

عطا فرما دیا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے تمہیں سردار بنا دیا اور لوگ تمہیں اپنا قائد سمجھتے ہیں تو سمجھ لو کہ یہ اللہ تعالیٰ نے ایک خدمت تمہارے ذمے سپرد کی ہے، تمہیں اس خدمت کا حق ادا کرنا ہے، لیکن اپنے بارے میں یہ خیال کرو کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میں نہ تو قائد بننے کے لائق ہوں اور نہ سردار بننے کے لائق ہوں، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس خدمت پر لگا دیا ہے اسلئے اس خدمت پر لگا ہوا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح فہم عطا فرمائے اور ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

﴿وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین﴾

سودی نظام کی خرابیاں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب : حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی
ضبط و ترتیب : محمد عبداللہ میمن
تاریخ : ۲۴ اپریل ۱۹۹۲ء
مقام : جامع مسجد اور لینڈو۔ فلوریڈا، امریکہ

"سود کو قرآن کریم نے اتنا بڑا گناہ قرار دیا کہ شاید کسی اور گناہ کو اتنا بڑا گناہ قرار نہیں دیا۔ چناں چہ فرمایا کہ "اگر تم سو نہیں چھوڑو گے تو اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف سے اعلان جنگ سن لو" یہ اعلان جنگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی اور گناہ پر نہیں کیا گیا۔ چنانچہ جو لوگ شراب پیتے ہیں ان کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ ان کے خلاف اعلان جنگ ہے یا جو لوگ خنزیر کھاتے ہیں یا جو لوگ زنا کاری کرتے ہیں یا جو لوگ چوری کرتے ہیں ان کے بارے میں یہ کہیں نہیں فرمایا کہ ان کے خلاف اعلان جنگ ہے لیکن "سود" کے بارے میں فرمایا کہ جو لوگ سودی معاملات نہیں چھوڑتے ان کے لئے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف سے اعلان جنگ ہے اس پر اتنی سخت اور سنگین وعید نازل ہوئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سودی نظام کی خرابیاں اور اس کا متبادل

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا، من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، واشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، واشھد ان سیدنا وسندنا ونبینا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ، صلی اللہ تعالی علیہ وعلی الہ واصحابہ وبارک وسلم تسلیماً کثیرا، اما بعد،

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمن الرحیم: یمحق اللہ الربا و یربی الصدقات

(سورۃ البقرہ: ۲۷۶)

آمنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم ونحن

علی ذلک من الشاہدین والشاکرین، والحمد للہ رب العالمین

مغربی دنیا کے مسلمانوں کی مشکلات

میرے محترم بھائیو اور بہنو! آج کی اس نشست کے لئے جو موضوع تجویز کیا گیا ہے وہ "ربا" سے متعلق ہے۔ جس کو اردو میں "سود" اور انگریزی میں Usury یا Interest کہا جاتا ہے۔ اور غالباً اس موضوع کو اختیار کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یوں تو ساری دنیا میں اس وقت سود کا نظام چلا ہوا ہے۔ لیکن بالخصوص مغربی دنیا میں جہاں آپ حضرات قیام پذیر ہیں، وہاں بیشتر معاشی سرگرمیاں سود کی بنیاد پر چل رہی ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو قدم قدم پر یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ وہ کس طرح معاملات کریں اور سود سے کس طرح چھٹکارا حاصل کریں۔ اور آج کل مختلف قسم کی غلط فہمیاں بھی لوگوں کے درمیان پھیلائی جارہی ہیں کہ آجکل معاشی زندگی میں جو Interest چل رہا ہے وہ در حقیقت حرام نہیں ہے اس لئے کہ یہ اس "ربا" کی تعریف میں داخل نہیں ہوتا جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا تھا۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے اس وقت یہ موضوع دیا گیا ہے کہ میں Interest کے موضوع پر جو بنیادی معلومات ہیں وہ قرآن و سنت اور موجودہ حالات کی روشنی میں آپ کے سامنے پیش کروں۔

سودی معاملہ کرنے والوں کے لئے اعلان جنگ

سب سے پہلی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ "سود" کو قرآن کریم نے اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے کہ شاید کسی اور گناہ کو اتنا بڑا گناہ قرار نہیں دیا۔ مثلاً شراب نوشی، خنزیر کھانا، زنا کاری، بدکاری وغیرہ کے لئے قرآن کریم میں وہ الفاظ استعمال نہیں کئے گئے جو "سود" کے لئے استعمال کئے گئے ہیں چنانچہ فرمایا کہ:

"یا یہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربا ان
کنتم مومنین ○ فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ"

(سورۃ البقرۃ: ۲۷۶)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور "سود" کا جو حصہ بھی رہ گیا ہو اس کو چھوڑ

دو۔ اگر تمہارے اندر ایمان ہے، اگر تم "سود" کو نہیں چھوڑو گے، یعنی سود کے معاملات کرتے رہو گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو "یعنی ان کے لئے اللہ کی طرف سے لڑائی کا اعلان ہے، یہ اعلان جنگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بھی گناہ پر نہیں کیا گیا۔ چنانچہ جو لوگ شراب پیتے ہیں، ان کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا کہ ان کے خلاف اعلان جنگ ہے یا جو خنزیر کھاتے ہیں انکے خلاف اعلان جنگ ہے اور نہ یہ کہا گیا کہ جو "زنا" کرتے ہیں ان کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ لیکن "سود" کے بارے میں فرمایا کہ جو لوگ سود کے معاملات کو نہیں چھوڑتے ان کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے اتنی سخت اور سنگین وعید اس پر وارد ہوئی ہے اب سوال یہ ہے کہ اس پر اتنی سنگین اور سخت وعید کیوں ہے؟ اس کی تفصیل انشاء اللہ آگے معلوم ہو جائے گی۔

"سود کس کو کہتے ہیں؟

لیکن اس سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ "سود" کس کو کہتے ہیں؟ "سود" کیا چیز ہے اس کی تعریف کیا ہے؟ جس وقت قرآن کریم نے "سود" کو حرام قرار دیا اس وقت اہل عرب میں "سود" کا لین دین متعارف اور مشہور تھا۔ اور اس وقت "سود" اسے کہا جاتا تھا کہ کسی شخص کو دیئے ہوئے قرض پر طے کر کے کسی بھی قسم کی زیادہ رقم کا مطالبہ کیا جائے اسے "سود" کہا جاتا تھا۔ مثلاً میں نے آج ایک شخص کو سو روپے بطور قرض دیئے۔ اور میں اس سے کہوں کہ میں ایک مہینے کے بعد یہ رقم واپس لوں گا اور تم مجھے ایک سو دو روپے واپس کرنا اور یہ پہلے سے میں نے طے کر دیا کہ ایک ماہ بعد ایک سو دو روپے واپس لوں گا۔ تو یہ "سود" ہے۔

معاہدہ کے بغیر زیادہ دینا سود نہیں

پہلے سے طے کرنے کی شرط اس لئے لگائی کہ اگر پہلے سے کچھ طے نہیں کیا ہے۔ مثلاً میں نے کسی کو سو روپے قرض دے دیئے۔ اور میں نے اس سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ تم مجھے ایک سو دو روپے واپس کرو گے، لیکن واپسی کے وقت اس نے اپنی

خوشی سے مجھے ایک سو دو روپے دے دیئے۔ اور ہمارے درمیان یہ ایک سو دو روپے واپس کرنے کی بات طے شدہ نہیں تھی۔ تو یہ سود نہیں ہے اور حرام نہیں ہے بلکہ جائز ہے۔

قرض کی واپسی کی عمدہ شکل

خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ جب آپ کسی کے مقروض ہوتے تو وہ قرض خواہ قرض کا مطالبہ کرتا تو آپ وہ قرض کچھ زیادتی کے ساتھ بڑھتا ہوا واپس فرماتے، تاکہ اس کی دل جوئی ہو جائے لیکن یہ زیادتی چونکہ پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی تھی اس لئے وہ "سود" نہیں ہوتی تھی اور حدیث کی اصطلاح میں اس کو "حسن القضاء" کہا جاتا ہے، یعنی اچھے طریقے سے قرض کی ادائیگی کرنا۔ اور ادائیگی کے وقت اچھا معاملہ کرنا، اور کچھ زیادہ دے دینا، یہ "سود" نہیں ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا کہ:

ان خیارکم احسنکم قضاء

(صحیح بخاری، کتاب الاستقراض۔ باب حسن القضاء حدیث نمبر ۲۳۹۳)

یعنی تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرض کی ادائیگی میں اچھا معاملہ کرنے والے ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص قرض دیتے وقت یہ طے کرلے کہ میں جب واپس لوں گا تو زیادتی کے ساتھ لوں گا، اس کو "سود" کہتے ہیں۔ اور قرآن کریم نے اسی کو سخت اور سنگین الفاظ کے ساتھ حرام قرار دیا۔ اور سورۃ بقرہ کے تقریباً، پورے دو رکوع اس "سود" کی حرمت پر نازل ہوئے ہیں۔

قرآن کریم نے کس "سود" کو حرام قرار دیا؟

بعض اوقات ہمارے معاشرے میں یہ کہا جاتا ہے کہ جس "سود" کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا تھا۔ وہ در حقیقت یہ تھا کہ اس زمانے میں قرض لینے والا غریب ہوتا تھا۔ اور اسکے پاس روٹی اور کھانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے تھے اگر وہ بیمار ہے تو اس کے پاس علاج کے لئے پیسے نہیں ہوتے تھے اگر گھر میں کوئی میت ہو گئی ہے تو اسکے پاس

اس کو کفنانے اور دفنانے کے پیسے نہیں ہوتے تھے، ایسے موقع پر وہ غریب بیچارہ کسی سے پیسے مانگتا تو وہ قرض دینے والا اس سے کہتا کہ میں اس وقت تک قرض نہیں دوں گا جب تک تم مجھے اتنا فیصد زیادہ واپس نہیں دو گے تو چونکہ یہ ایک انسانیت کے خلاف بات تھی کہ ایک شخص کو ایک ذاتی ضرورت ہے اور وہ بھوکا اور ننگا ہے ایسی حالت میں اس کو سود کے بغیر پیسے فراہم نہ کرنا ظلم اور زیادتی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا۔ اور سود لینے والے کے خلاف اعلان جنگ کیا۔

لیکن ہمارے دور میں اور خاص طور پر بینکوں میں جو سود کے ساتھ روپے کا لین دین ہوتا ہے۔ اس میں قرض لینے والا کوئی غریب اور فقیر نہیں ہوتا۔ بلکہ اکثر اوقات وہ بڑا دولت مند اور سرمایہ دار ہوتا ہے اور وہ قرض اس لئے نہیں لیتا کہ اس کے پاس کھانے کو نہیں ہے، یا اس کے پاس پہننے کے لئے کپڑے نہیں ہے۔ یا وہ کسی بیماری کے علاج کے لئے قرض نہیں لے رہا ہے، بلکہ وہ اس لئے قرض لے رہا ہے تاکہ ان پیسوں کو اپنی تجارت اور کاروبار میں لگائے اور اس سے نفع کمائے۔ اب اگر قرض دینے والا شخص یہ کہے کہ تم میرے پیسے اپنے کاروبار میں لگاؤ گے۔ اور نفع کماؤ گے تو اس نفع کا دس فیصد بطور نفع کے مجھے دو۔ تو اس میں کیا قباحت اور برائی ہے؟ اور یہ وہ "سود" نہیں ہے جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، یہ اعتراض دنیا کے مختلف خطوں میں اٹھایا جاتا ہے۔

تجارتی قرض (Commercial Loan) ابتدائی زمانے میں بھی تھے

ایک اعتراض یہ اٹھایا ہے کہ یہ کاروباری سود (Commercial Interest) اور یہ تجارتی قرض (Commercial Loan) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھے، بلکہ اس زمانے میں ذاتی اخراجات اور ذاتی استعمال کے لئے قرضے لئے جاتے تھے لہٰذا قرآن کریم اس کو کیسے حرام قرار دے سکتا ہے جس کا اس زمانے میں وجود ہی نہیں تھا۔ اس لئے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے جس "سود" کو حرام قرار دیا ہے، وہ غریبوں اور فقیروں والا "سود" تھا۔ اور یہ کاروباری سود حرام نہیں

ہے۔

صورت بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی

پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی چیز کے حرام ہونے کے لئے یہ بات ضروری نہیں ہے کہ وہ اس خاص صورت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی پائی جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس انداز سے اس کا وجود بھی ہو۔ قرآن کریم جب کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کی ایک حقیقت اس کے سامنے ہوتی ہے اور اس حقیقت کو وہ حرام قرار دیتا ہے چاہے اس کی کوئی خاص صورت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود ہو یا نہ ہو اس کی مثال یوں سمجھئے کہ قرآن کریم نے شراب کو حرام قرار دیا ہے۔ اور شراب کی حقیقت یہ ہے کہ ایسا مشروب جس میں نشہ ہو اب آج اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ صاحب! آجکل کی یہ وہسکی (Whisky) بیئر (Beer) اور برانڈی (Brandy) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو پائی نہیں جاتی تھی۔ لہٰذا یہ حرام نہیں ہے، تو یہ بات صحیح نہیں ہے اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اگر چہ یہ اس خاص شکل میں موجود نہیں تھی، لیکن اس کی حقیقت یعنی "ایسا مشروب جو نشہ آور ہو" موجود تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام قرار دے دیا تھا۔ لہذا اب وہ ہمیشہ کے لئے حرام ہو گئی، اب چاہے شراب کی نئی شکل آجائے۔ اور اس کا نام چاہے وہسکی (Whisky) رکھ دیا جائے یا برانڈی رکھ لو یا بئر رکھ لو یا کوک (Coke) رکھ لو، نشہ آور مشروب ہر شکل اور ہر نام کے ساتھ حرام ہے۔

اس لئے یہ کہنا کہ "کمرشل لون" چونکہ اس زمانے میں نہیں تھے بلکہ آج پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے حرام نہیں ہیں، یہ خیال درست نہیں۔

ایک لطیفہ

ایک لطیفہ یاد آیا ہندوستان کے اندر ایک گویا (گانے والا) تھا۔ وہ ایک مرتبہ حج کرنے چلا گیا۔ حج کے بعد وہ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ جا رہا تھا کہ راستے میں ایک منزل پر

اس نے قیام کیا اس زمانے میں مختلف منزلیں ہوتی تھیں۔ لوگ ان منزلوں پر رات گزارتے اور اگلے دن صبح آگے کا سفر کرتے۔ اس لئے گویے نے راستے میں ایک منزل پر رات گزارنے کے لئے قیام کیا اور اس منزل پر ایک عرب گویا بھی آگیا، اور اس نے وہاں بیٹھ کر عربی میں گانا بجانا شروع کر دیا عرب گویے کی آواز ذرا بھدی اور خراب تھی۔ کریہ الصوت تھا اب ہندوستانی گویے کو اسکی آواز بہت بری لگی۔ اور اس نے اٹھ کر کہا کہ آج یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے گانا بجانا کیوں حرام قرار دیا تھا اس لئے کہ آپ نے ان بدوؤں کا گانا سنا تھا اس لئے حرام قرار دے دیا اگر آپ میرا گانا سن لیتے تو آپ گانا بجانا حرام قرار نہ دیتے۔

آج کل کا مزاج

آجکل یہ مزاج بن گیا ہے کہ ہر چیز کے بارے میں لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! حضور اقدس صلی علیہ وسلم کے زمانے میں یہ عمل اس طرح ہوتا تھا۔ اس لئے آپ نے اس کو حرام قرار دے دیا۔ آج چونکہ یہ عمل اس طرح نہیں ہو رہا ہے لہٰذا وہ حرام نہیں ہے کہنے والے یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ خنزیروں کو اس لئے حرام قرار دیا گیا تھا کہ وہ گندے ماحول میں پڑے رہتے تھے غلاظت کھاتے تھے گندے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی تھی اب تو بہت صاف ستھرے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی ہے اور ان کے لئے اعلیٰ درجے کے فارم قائم کر دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا اب ان کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

شریعت کا ایک اصول

یاد رکھئے، قرآن کریم جب کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کی ایک حقیقت ہوتی ہے اس کی صورتیں چاہے کتنی بدل جائیں اور اس کو بنانے اور تیار کرنے کے طریقے چاہے کتنے بدلتے رہیں۔ لیکن اس کی حقیقت اپنی جگہ بر قرار رہتی ہے۔ اور وہ حقیقت حرام ہوتی ہے یہ شریعت کا اصول ہے۔

زمانہ نبوت کے بارے میں ایک غلط فہمی

پھر یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تجارتی قرضوں (Commercial Loan) کا رواج نہیں تھا۔ اور سارے قرضے صرف ذاتی ضرورت کے لئے لیے جاتے تھے اس موضوع پر میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ نے "مسئلہ سود" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اس کا دوسرا حصہ میں نے لکھا ہے۔ اس حصہ میں میں نے کچھ مثالیں پیش کی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی تجارتی قرضوں کا لین دین ہوتا تھا۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ عرب صحرانشین تھے تو اسکے ساتھ ہی لوگوں کے ذہن میں یہ تصور آتا ہے کہ وہ معاشرہ جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔ وہ ایسا سادہ اور معمولی معاشرہ ہوگا جس میں تجارت وغیرہ تو ہوتی نہیں ہوگی اور اگر تجارت ہوتی بھی ہوگی تو صرف گندم اور جو وغیرہ کی ہوتی ہوگی۔ اور وہ بھی دس بیس روپے سے زیادہ کی نہیں ہوگی اس کے علاوہ کوئی بڑی تجارت نہیں ہوتی ہوگی عام طور پر ذہن میں یہ تصور بیٹھا ہوا ہے۔

ہر قبیلہ جائنٹ اسٹاک کمپنی ہوتا تھا

لیکن یاد رکھئے یہ بات درست نہیں عرب کا وہ معاشرہ جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اس میں بھی آج کی جدید تجارت کی تقریباً ساری بنیادیں موجود تھیں۔ مثلاً آجکل "جائنٹ اسٹاک کمپنیاں" ہیں۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ چودھویں صدی کی پیداوار ہے اس سے پہلے "جائنٹ اسٹاک کمپنی" کا تصور نہیں تھا۔ لیکن جب ہم عرب کی تاریخ پڑھتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ عرب کا ہر قبیلہ ایک مستقل "جائنٹ اسٹاک کمپنی" ہوتا تھا اس لئے کہ ہر قبیلے میں تجارت کا طریقہ یہ تھا کہ قبیلہ کے تمام آدمی ایک روپیہ دو روپیہ لاکر ایک جگہ جمع کرتے اور وہ رقم "شام" بھیج کر وہاں سے سامان تجارت منگواتے آپ نے تجارتی قافلوں (Commercial Caravan) کا نام سنا ہوگا۔ وہ "کاروان" یہی ہوتے تھے کہ سارے قبیلے نے ایک ایک روپیہ جمع کر کے دوسری جگہ بھیجا اور وہاں سے سامان تجارت منگوا کر یہاں فروخت

کر دیا چنانچہ قرآن کریم میں یہ جو فرمایا کہ:

لا یلاف قریش ایلا فهم رحلة الشتاء والصیف

(سورۃ قریش: ۱)

وہ بھی اسی بناء پر کہ یہ عرب کے لوگ سردیوں میں یمن کی طرف سفر کرتے تھے اور گرمیوں میں شام کی طرف سفر کرتے تھے اور گرمیوں اور سردیوں کے یہ سفر محض تجارت کے لئے ہوتے تھے۔ یہاں سے سامان لے جاکر وہاں بیچ دیا وہاں سے سامان لاکر یہاں بیچ دیا اور بعض اوقات ایک ایک آدمی اپنے قبیلے سے دس لاکھ دینار قرض لیتا تھا اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس لئے قرض لیتا تھا کہ اس کے گھر میں کھانے کو نہیں تھا؟ یا اس کے پاس میت کو کفن دینے کے لئے کپڑا نہیں تھا؟ ظاہر ہے کہ جب وہ اتنا بڑا قرض لیتا تھا تو وہ کسی کمرشل مقصد کے لئے لیتا تھا۔

سب سے پہلے چھوڑا جانے والا سود

جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر سود کی حرمت کا اعلان فرمایا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

وربا الجاہلیة موضوع واول رباً اضع ربانا ربا عباس بن عبد المطلب فانه موضوع کله،

(صحیح مسلم، کتاب الحج باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر ۱۲۱۸)

یعنی (آج کے دن) جاہلیت کا سود چھوڑ دیا گیا اور سب سے پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں وہ ہمارے چچا حضرت عباس کا سود ہے، وہ سب کا سب ختم کر دیا گیا، چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ لوگوں کو سود پر قرض دیا کرتے تھے۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ آج کے دن میں ان کا سود جو دوسرے لوگوں کے ذمے ہیں وہ ختم کرتا ہوں اور روایات میں آتا ہے کہ وہ دس ہزار مثقال سونا تھا۔ اور تقریباً ۴ ماشے کا ایک مثقال ہوتا ہے، اور یہ دس ہزار مثقال کوئی سرمایہ (Principal) نہیں تھا۔ بلکہ یہ سود تھا جو لوگوں کے ذمے اصل رقوم پر واجب ہوا تھا۔

اس سے اندازہ لگائیے کہ وہ قرض جس پر دس ہزار کا سود لگ گیا ہو، کیا وہ قرض

صرف کھانے کی ضرورت کے لئے لیا گیا تھا؟ ظاہر ہے کہ وہ قرض تجارت کے لئے لیا گیا ہو گا۔

عہد صحابہ میں بینکاری کی ایک مثال

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنے پاس بالکل ایسا نظام قائم کیا ہوا تھا جیسے آجکل بینکنگ کا نظام ہوتا ہے۔ لوگ جب ان کے پاس اپنی امانتیں لا کر رکھواتے تو یہ ان سے کہتے کہ میں یہ امانت کی رقم بطور قرض لیتا ہوں یہ رقم میرے ذمے قرض ہے۔ اور پھر آپ اس رقم کو تجارت میں لگاتے۔ چنانچہ جس وقت آپ کا انتقال ہوا تو اس وقت جو قرض ان کے ذمہ تھا۔ اس کے بارے میں ان کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"فحسبت ما عليه من الديون فوجدته الفي الف وماتي الف"

یعنی میں نے ان کے ذمہ واجب الاداء قرضوں کا حساب لگایا تو وہ بائیس لاکھ دینار نکلے۔

(مسئلہ سود ص ۱۱۳، بحوالہ طبقات لابن سعد، ص ۱۰۹ ج ۳)

لہٰذا یہ کہنا کہ اس زمانے میں تجارتی قرض نہیں ہوتے تھے۔ یہ بالکل خلاف واقعہ بات ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تجارتی قرض بھی ہوتے تھے، اور اس پر "سود" کا لین دین بھی ہوتا تھا، اور قرآن کریم نے ہر قرض پر جو بھی زیادتی وصول کی جائے اس کو حرام قرار دیا ہے لہٰذا یہ کہنا کہ کمرشل لون پر انٹرسٹ لینا جائز ہے اور ذاتی قرضوں پر انٹرسٹ لینا جائز نہیں، یہ بالکل غلط ہے۔

سود مرکب اور سود مفرد دونوں حرام ہیں

اس کے علاوہ ایک اور غلط فہمی پھیلائی جا رہی ہے۔ وہ یہ کہ ایک سود مفرد (Simple Interest) ہوتا ہے اور ایک سود مرکب (Compound Interest) ہوتا ہے، یعنی سود پر بھی سود لگتا چلا جائے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مرکب سود ہوتا تھا اور قرآن کریم نے اس کو

حرام قرار دیا ہے لہٰذا وہ تو حرام ہے لیکن سود مفرد جائز ہے اس لئے کہ وہ اس زمانے میں نہیں تھا اور نہ ہی قرآن نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ابھی قرآن کریم کی جو آیت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی اس میں فرمایا کہ:

" یا یھا الذین امنوا اتقوا اللہ وذروا مابقی من الربا "

(سورۃ البقرۃ: ۲۷۸)

یعنی اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور ربا کا جو حصہ بھی رہ گیا ہو، اس کو چھوڑ دو، یعنی اسکے کم یا زیادہ ہونے کا کوئی سوال نہیں یا Rate Of Interest کے کم یا زیادہ ہونے کی بحث نہیں جو کچھ بھی ہو اس کو چھوڑ دو۔ اور اس کے بعد آگے فرمایا کہ:

وان تبتم فلکم روس اموالکم

(سورۃ البقرہ: ۲۷۹)

یعنی اگر تم ربا سے توبہ کر لو تو پھر تمہارا جو راس المال (Principal) ہے وہ تمہارا حق ہے اور خود قرآن کریم نے واضح طور پر فرمادیا کہ Principal تو تمہارا حق ہے لیکن اس کے علاوہ تھوڑی سی زیادتی بھی ناجائز ہے لہٰذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سود مرکب حرام ہے اور سود مفرد حرام نہیں، بلکہ سود کم ہو یا زیادہ سب حرام ہے اور قرض لینے والا غریب ہو تب بھی حرام ہے اور قرض لینے والا امیر اور مالدار ہو تو بھی حرام ہے اگر کوئی شخص ذاتی ضرورت کے لئے قرض لے رہا ہو تو بھی حرام ہے اور اگر تجارت کے لئے قرض لے رہا ہو تو بھی حرام ہے اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

موجودہ بینکنگ انٹرسٹ بالاتفاق حرام ہے

یہاں یہ بات بھی عرض کر دوں کہ تقریباً ۵۰، ۶۰ سال تک عالم اسلام میں بینکنگ انٹرسٹ (Banking Interest) کے بارے میں سوالات اٹھائے جاتے رہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ Compound Interest حرام ہے، Simple Interest حرام نہیں ہے یا یہ کہنا کہ Commercial Laon حرام نہیں ہے وغیرہ۔ یہ اشکالات اور اعتراضات عالم اسلام میں تقریباً ۵۰ سال تک ہوتے رہے ہیں لیکن اب یہ بحث ختم ہو گئی ہے، اب ساری دنیا کے نہ صرف علماء

بلکہ ماہرین معاشیات اور مسلم بینکرز بھی اس بات پر متفق ہیں کہ بینکنگ انٹرسٹ بھی اسی طرح حرام ہے، جس طرح عام قرض کے لین دین پر سود حرام ہوتا ہے اور اب اس پر اجماع ہو چکا ہے کسی قابل ذکر شخص کا اس میں اختلاف نہیں، اس کے بارے میں آخری فیصلہ آج سے تقریباً ۴ سال پہلے جدہ میں مجمع الفقہ الاسلامی (Islamic Fiqh Academy) جس میں تقریباً ۴۵ مسلم ملکوں کے سرکردہ علماء کا اجتماع ہوا، اور جس میں، میں بھی شامل تھا۔ اور ان تمام ملکوں کے تقریباً ۲۰۰ علماء نے بالاتفاق یہ فتویٰ دیا کہ بینکنگ انٹرسٹ بالکل حرام ہے۔ اور اس کے جائز ہونے کا کوئی راستہ نہیں لہٰذا یہ مسئلہ تو اب ختم ہو چکا ہے کہ حرام ہے یا نہیں؟

کمرشل لون پر انٹرسٹ میں کیا خرابی ہے؟

اب ایک بات باقی رہ گئی ہے اس کو بھی سمجھ لینا چاہئے، وہ یہ کہ شروع میں جیسا کہ عرض کیا تھا کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صرف ذاتی ضرورت کے لئے قرضے لئے جاتے تھے۔ اب اگر ایک شخص ذاتی ضرورت کے لئے قرض لے رہا ہے مثلاً اس کے پاس کھانے کو روٹی نہیں ہے یا میت کو دفنانے کے لئے کفن نہیں ہے اس کے لئے وہ قرض لے رہا ہے اور آپ اس سے سود کا مطالبہ کر رہے ہیں یہ تو ایک غیر انسانی حرکت اور ناانصافی کی بات ہے، لیکن جو شخص میرے پیسے کو تجارت میں لگا کر نفع کمائے گا اگر میں نفع میں اس سے تھوڑا حصہ لے لوں تو اس میں کیا خرابی ہے؟

آپ کو نقصان کا خطرہ (Risk) بھی برداشت کرنا ہوگا

پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک مسلمان کو اللہ کے کسی حکم میں چوں چرا کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے، اگر کسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا۔ وہ حرام ہو گئی لیکن زیادہ اطمینان کے لئے یہ بات عرض کرتا ہوں تاکہ یہ بات اچھی طرح دل میں اتر جائے وہ یہ کہ اگر آپ کسی شخص کو قرض دے رہے ہیں۔ تو اس کے بارے میں اسلام یہ کہتا ہے کہ دو باتوں میں سے ایک بات متعین کر لو، کیا تم اس کی کچھ امداد کرنا چاہتے ہو؟ یا اس کے

کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتے ہو؟ اگر قرض کے ذریعہ اس کی امداد کرنا چاہتے ہو تو وہ پھر آپ کی طرف سے صرف امداد ہی ہوگی، پھر آپ کو اس قرض پر زیادتی کے مطالبے کا کوئی حق نہیں، اور اگر اس کے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتے ہو تو پھر جس طرح نفع میں حصہ دار بنو گے اسی طرح نقصان میں بھی اس کے حصہ دار بننا ہو گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم صرف نفع میں حصہ دار بن جاؤ، نفع ہو تو تمہارا، اور اگر نقصان ہو تو وہ اس کا، لہٰذا جس صورت میں آپ اس کو کاروبار کے لئے پیسے دے رہے ہیں تو پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ کاروبار میں نقصان کا خطرہ (Risk) تو وہ برداشت کرے، اور نفع آپ کو مل جائے بلکہ اس صورت میں آپ اس کو قرض نہ دیں، بلکہ اس کے ساتھ ایک جوائنٹ انٹرپرائز، (Joint Enterprise) کیجئے، اور اس کے ساتھ "مشارکہ" اور پارٹنر شپ (Partnership) کیجئے۔ یعنی اس سے معاہدہ کریں کہ جس کاروبار کے لئے تم قرض لے رہے ہو۔ اس میں اتنا فیصد نفع میرا ہو گا۔ اور اتنا تمہارا ہو گا، اگر اس کاروبار میں نقصان ہو گا تو وہ نقصان بھی اسی نفع کے تناسب سے ہو گا لیکن یہ بالکل درست نہیں ہے کہ آپ تو اس سے یہ کہیں کہ اس قرض پر ۱۵ فیصد نفع آپ سے لوں گا۔ چاہے تمہیں کاروبار میں نفع ہو، یا نقصان ہو۔ یہ بالکل حرام ہے، اور سود ہے۔

آج کل کے انٹرسٹ کے نظام کی خرابی

آج کل انٹرسٹ (Interest) کا جو نظام رائج ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض اوقات قرض لینے والے کو نقصان ہو گیا۔ تو اس صورت میں قرض دینے والا فائدہ میں رہا، اور قرض لینے والا نقصان میں رہا، اور بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ قرض لینے والے نے زیادہ شرح سے نفع کمایا، اور قرض دینے والے کو اس نے معمولی شرح سے نفع دیا۔ اب قرض دینے والا نقصان میں رہا۔ اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھئے۔

ڈیپازیٹر ہر حال میں نقصان میں ہے

مثلاً ایک شخص ایک کروڑ روپیہ قرض لے کر اس سے تجارت شروع کرتا ہے۔ اب وہ ایک کروڑ روپیہ کہاں سے اس کے پاس آیا؟ وہ ایک کروڑ روپیہ کس کا ہے؟ ظاہر

ہے کہ وہ روپیہ اس نے بینک سے لیا۔ اور بینک کے پاس وہ روپیہ ڈیپازیٹرس کا ہے۔ گویا کہ وہ ایک کروڑ روپیہ پوری قوم کا ہے۔ اور اب اس نے قوم کے اس ایک کروڑ روپے سے تجارت شروع کی اور اس تجارت کے اندر اس کو سو فیصد نفع ہوا، اور اب اس کے پاس دو کروڑ ہو گئے، جس میں سے ۱۵ فیصد یعنی ۱۵ لاکھ روپے اس نے بینک کو دیئے، اور پھر بینک نے اس میں سے اپنا کمیشن اور اپنے اخراجات نکال کر باقی ۷ فیصد یا دس فیصد کھاتہ دار (Depositors) کو دے دیئے، نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کا پیسہ تجارت میں لگا تھا، جس سے اتنا نفع ہوا ان کو تو سو روپے پر صرف دس روپے نفع ملا، اور یہ بیچارہ ڈیپازیٹر بڑا خوش ہے کہ میرے سو روپے اب ایک سو دس ہو گئے، لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ حقیقت میں اس کے پیسوں سے جو نفع کمایا گیا اس کے لحاظ سے ایک سو کے دو سو ہونے چاہئے تھے، اور پھر دوسری طرف یہ دس روپے جو نفع اس کو ملا، قرض لینے والا اس کو دوبارہ اس سے واپس وصول کر لیتا ہے۔ وہ کس طرح واپس وصول کرتا ہے؟

سود کی رقم مصارف میں شامل ہوتی ہے

وہ اس طرح وصول کرتا ہے کہ قرض لینے والا ان دس رپوں کو پیداواری اخراجات اور مصارف (Cost Of Production) میں شامل کر لیتا ہے مثلاً فرض کرو کہ اس نے ایک کروڑ روپیہ بینک سے قرض لے کر کوئی فیکٹری لگائی۔ یا کوئی چیز تیار کی تو تیاری کے مصارف (Cost) میں ۱۵ فیصد بھی شامل کر دیئے جو اس نے بینک کو ادا کئے۔ لہٰذا جب وہ پندرہ فیصد بھی شامل ہو گئے تو اب جو چیز تیار (Produce) ہو گی، اس کی قیمت پندرہ فیصد بڑھ جائے گی۔ مثلاً اس نے کپڑا تیار کیا تھا۔ تو اب انٹرسٹ کی وجہ سے اس کپڑے کی قیمت پندرہ فیصد بڑھ گئی۔ لہٰذا ڈیپازیٹر جس کو ایک سو کے ایک سو دس روپے ملے تھے۔ جب بازار سے کپڑا خریدے گا تو اس کو اس کپڑے کی قیمت پندرہ فیصد زیادہ دینی ہو گی، تو نتیجہ یہ نکلا کہ ڈیپازیٹر کو جو دس فیصد منافع دیا گیا تھا وہ دوسرے ہاتھ سے اس سے زیادہ کر کے پندرہ فیصد وصول کر لیا گیا۔ یہ تو خوب نفع کا سودا ہوا۔ وہ ڈیپازیٹر خوش ہے کہ مجھے سو روپے کے ایک سو دس روپے مل گئے۔ لیکن حقیقت میں

اگر دیکھا جائے تو اس کو سو روپے کے بدلے = / ۹۵ روپے ملے۔ اس لئے کہ وہ پندرہ فیصد کپڑے کی کوسٹ میں چلے گئے، اور دوسری طرف ۸۵ فیصد منافع اس قرض لینے والے کی جیب میں چلے گئے۔

شرکت کا فائدہ

اور اگر شرکت پر معاملہ ہوتا، اور یہ طے پاتا کہ مثلاً ۵۰ فیصد نفع سرمایہ لگانے والے (Financier) کا ہوگا، اور ۵۰ فیصد کام کرنے والے تاجر کا ہوگا۔ تو اس صورت میں عوام کو ۱۵ فیصد کے بجائے ۵۰ فیصد نفع ملتا اور اس صورت میں یہ ۵۰ فیصد اس چیز کی لاگت (Cost) میں بھی شامل نہ ہوتا اس لئے کہ نفع تو اس پیداوار کی فروخت کے بعد سامنے آئے گا اور پھر اس کو تقسیم کیا جائے گا۔ اس لئے کہ سود (Interest) تو لاگت (Cost) میں شامل کیا جاتا ہے لیکن نفع (Profit) لاگت (Cost) میں شامل نہیں کیا جاتا، تو یہ صورت اجتماعی نفع کی تھی۔

نفع کسی کا اور نقصان کسی اور کا

اور اگر فرض کرو کہ ایک کروڑ روپیہ بینک سے قرض لے کر جو تجارت کی، اس تجارت میں اس کو نقصان ہوگیا وہ بینک اس نقصان کے نتیجے میں دیوالیہ ہوگیا، اب اس بینک کے دیوالیہ ہونے کے نتیجے میں کس کا روپیہ گیا؟ ظاہر ہے کہ عوام کا گیا۔ تو اس نظام میں نقصان ہونے کی صورت میں سارا نقصان عوام پر ہے۔ اور اگر نفع ہے تو سارا کا سارا قرض لینے والے کا۔

بیمہ کمپنی سے کون فائدہ اٹھا رہا ہے

قرض لینے والے تاجر کا اگر نقصان ہو جائے تو اس نے اس نقصان کی تلافی کے لئے ایک اور راستہ تلاش کر لیا ہے، وہ ہے انشورنس (Insurance) مثلاً فرض کرو کہ روئی کے گودام میں آگ لگ گئی تو اس نقصان کو پورا کرنے کا فریضہ انشورنس کمپنی پر عائد

ہوتا ہے اور انشورنس کمپنی میں کس کا پیسہ ہے؟ وہ غریب عوام کا پیسہ ہے اس عوام کا پیسہ ہے جو اپنی گاڑی اس وقت تک سڑک پر نہیں لا سکتے جب تک اس کو انشورڈ (Insured) نہ کرالیں۔ اور عوام کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ نہیں ہوتا۔ اس کو آگ نہیں لگتی لیکن وہ بیمہ کی قسطیں (Premium) ادا کرنے پر مجبور ہیں۔

ان غریب عوام کے بیمہ کی قسطوں سے انشورنس کمپنی کی عمارت تعمیر کی گئی، اور غریب عوام کے ڈیپازیٹ کے ذریعہ تاجر کے نقصان کی تلافی کرتے ہیں، لہٰذا یہ سارا گورکھ دھندا اس لئے کیا جارہا ہے تاکہ اگر نفع ہو تو سرمایہ دار تاجر کا ہو، اور اگر نقصان ہو تو عوام کا ہو، اس کے نتیجے میں یہ صورت حال ہو رہی ہے۔ بنک میں جو پوری قوم کا روپیہ ہے۔ اگر اس کو صحیح طریقے پر استعمال کیا جاتا تو اس کے تمام منافع بھی عوام کو حاصل ہوتے۔ اور اب موجودہ نظام میں تقسیم دولت (Distribution of Wealth) کا جو سسٹم ہے۔ اس کے نتیجے میں دولت نیچے کی طرف جانے کے بجائے اوپر کی طرف جا رہی ہے۔ انہی خرابیوں کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سود کھانا ایسا ہے جیسے اپنی ماں سے زنا کاری کرنا۔ اتنا سنگین گناہ اس لئے ہے کہ اس کی وجہ سے پوری قوم کو تباہی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

سود کی عالمی تباہ کاری

آج سے پہلے ہم "سود" کو صرف اس لئے حرام مانتے تھے کہ قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ ہمیں اس کے عقلی دلائل سے زیادہ بحث نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جب حرام قرار دے دیا ہے۔ بس حرام ہے، لیکن آج اس کے نتائج آپ خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں آج پوری دنیا میں انٹرسٹ کا نظام جاری ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے اس ملک (امریکہ) کا دنیا میں طوطی بول رہا ہے۔ اور اب تو اس کا دوسرا حریف بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اور اب کوئی اس سے ٹکر لینے والا موجود نہیں، لیکن پھر بھی اقتصادی ابتری کا شکار ہے۔ اس کی بنیاد بھی انٹرسٹ ہے، اس لئے یہ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں غریب فقیر قسم کے لوگ سود پر قرض لیا کرتے تھے۔ ان سے سود کا مطالبہ کرنا حرام تھا، لیکن آج اگر کوئی شخص کمرشل لون پر سود لے

رہا ہے تو اس کو حرام نہیں ہونا چاہئے عقلی اور معاشی اعتبار سے یہ بات درست نہیں ہے، اگر کوئی غیر جانبداری سے اس نظام کا مطالعہ کرے تو اس کو پتہ چل جائے گا کہ اس نظام نے دنیا کو تباہی کے آخری کنارے تک پہنچا دیا ہے۔ اور انشاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ لوگوں کے سامنے اس کی حقیقت کھل جائے گی۔ اور ان کو پتہ چل جائے گا کہ قرآن کریم نے سود کے خلاف اعلان جنگ کیوں کیا تھا؟ یہ تو سود کی حرمت کا ایک پہلو تھا جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا۔

سودی طریقہ کار کا متبادل

ایک دوسرا سوال بھی بہت اہم ہے جو آجکل لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم یہ تو مانتے ہیں کہ انٹرسٹ حرام ہے۔ لیکن اگر انٹرسٹ کو ختم کر دیا جائے تو پھر اس کا متبادل طریقہ کیا ہو گا جس کے ذریعہ معیشت کو چلایا جائے؟ اس واسطے کہ آج پوری دنیا میں معیشت کی روح انٹرسٹ پر قائم ہے۔ اور اگر اس کی روح کو نکال دیا جائے تو اس کو چلانے کا دوسرا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا۔ اس لئے لوگ کہتے ہیں کہ انٹرسٹ کے سوا کوئی دوسرا نظام موجود ہی نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو ممکن اور قابل عمل (Practicable) نہیں ہے۔ اور اگر کسی کے پاس قابل عمل طریقہ موجود ہے تو وہ بتائے کہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب تفصیل طلب ہے۔ اور ایک مجلس میں اس موضوع کا پورا حق ادا ہونا ممکن بھی نہیں ہے۔ اور اس کا جواب تھوڑا سا ٹیکنیکل بھی ہے۔ اور اس کو عام فہم اور عام الفاظ میں بیان کرنا آسان بھی نہیں ہے، لیکن میں اسکو عام فہم انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تاکہ آپ حضرات کی سمجھ میں آجائے۔

ناگزیر چیزوں کو شریعت میں ممنوع قرار نہیں دیا گیا

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو حرام قرار دے دیا کہ یہ چیز حرام ہے۔ تو پھر یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ چیز ناگزیر ہو، اس لئے کہ اگر وہ چیز ناگزیر ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو حرام قرار نہ دیتے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کا ارشاد

ہے۔

"لا يكلف الله نفساً الا وسعها"

(سورۃ البقرہ: ۲۸٦)

یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو کسی ایسی چیز کا حکم نہیں دیتے جو اس کی وسعت سے باہر ہو۔ لہٰذا ایک مومن کے لئے تو اتنی بات بھی کافی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک چیز کو حرام قرار دے دیا تو چونکہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں ہے کہ کونسی چیز انسان کے لئے ضروری ہے۔ اور کون سی چیز ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا جب اس چیز کو حرام قرار دے دیا تو یقیناً وہ چیز ضروری اور ناگزیر نہیں ہے۔ اس چیز میں کہیں خرابی ضرور ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ضروری اور ناگزیر معلوم ہو رہی ہے تو اب اس خرابی کو دور کرنے کی ضرورت ہے لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ اور یہ چیز ناگزیر ہے۔

سودی قرض کا متبادل قرض حسنہ ہی نہیں ہے

دوسری بات یہ ہے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں انٹرسٹ (Interest) جس کو قرآن کریم حرام قرار دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ جب کسی کو قرض دیا جائے تو ان کو غیر سودی قرض (Interest - Free Loan) دینا چاہئے۔ اور اس پر کسی منافع کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب انٹرسٹ ختم ہو جائے گا تو ہمیں پھر غیر سودی قرضے ملا کریں گے، پھر جتنا قرض چاہیں حاصل کریں، اور اس سے کوٹھیاں بنگلے بنائیں۔ اور اس سے فیکٹریاں قائم کریں۔ اور ہم سے کسی انٹرسٹ کا مطالبہ نہیں ہو گا۔ اور اسی سوچ کی بنا پر لوگ کہتے ہیں کہ یہ صورت قابل عمل (Practicable) نہیں ہے اس لئے کہ جب ہر شخص کو سود کے بغیر قرض دیا جائے گا تو پھر اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا کہ سب لوگوں کو بغیر سود کے قرضہ دے دیا جائے؟

سودی قرض کا متبادل "مشارکت" ہے

یاد رکھئے کہ انٹرسٹ کا متبادل (Alternative) قرض حسنہ نہیں ہے کہ کسی

کو ویسے ہی قرض دے دیا جائے بلکہ اس کا متبادل "مشارکت" ہے یعنی جب کوئی شخص کاروبار کے لئے قرضہ لے رہا ہے تو وہ قرض دینے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ میں تمہارے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتا ہوں، اگر تمہیں نفع ہو گا تو اس نفع کا کچھ حصہ مجھے دینا پڑے گا اور اگر نقصان ہو گا تو اس نقصان میں بھی میں شامل ہوں گا، تو اس کاروبار کے نفع اور نقصان دونوں میں قرض دینے والا شریک ہو جائے گا۔ اور یہ مشارکت ہو جائے گی، اور یہ انٹرسٹ کا متبادل طریقہ کار (Alternative System) ہے۔

اور "مشارکت" کا نظریاتی پہلو تو میں آپ کے سامنے پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ انٹرسٹ کی صورت میں تو دولت کا بہت معمولی حصہ کھاتہ دار (Depositor) کو ملتا ہے لیکن اگر "مشارکت" کی بنیاد پر کاروبار کیا جائے۔ اور سرمایہ کاری (Financing) "مشارکت" کی بنیاد پر ہو تو اس صورت میں تجارت کے اندر جتنا نفع ہو گا اس کا ایک متناسب (Proportionate) حصہ کھاتہ داروں کی طرف بھی منتقل ہو گا اور اس صورت میں تقسیم دولت (Distribution of Wealth) کا اوپر کی طرف جانے کے بجائے نیچے کی طرف آئے گا۔ لہٰذا اسلام نے جو متبادل نظام پیش کیا وہ "مشارکت" کا نظام ہے۔

مشارکت کے بہترین نتائج

لیکن یہ "مشارکت" کا نظام چونکہ موجودہ دنیا میں ابھی تک کہیں جاری نہیں ہے اور اس پر عمل نہیں ہوا اس لئے اس کی برکات بھی لوگوں کے سامنے نہیں آرہی ہیں ابھی گذشتہ بیس پچیس سال کے دوران مسلمانوں نے مختلف مقامات پر اس کی کوششیں کی ہیں کہ وہ ایسے مالیاتی ادارے اور بینک قائم کریں جو انٹرسٹ کی بنیاد پر نہ ہوں بلکہ ان کو اسلامی اصولوں کی بنیاد پر چلایا جائے اور شاید آپ کے علم میں بھی یہ بات ہو گی کہ اس وقت پوری دنیا میں کم از کم اسی سے لے کر سو تک ایسے بینک اور سرمایہ کاری کے ادارے قائم ہو چکے ہیں جن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اسلامی اصولوں پر اپنے کاروبار کو چلا رہے ہیں ، انٹرسٹ سے پاک کاروبار کر رہے ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ ان کا یہ دعویٰ سو فیصد صحیح ہے مگر ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں بھی ہوں۔ لیکن بہرحال! یہ

حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں تقریباً ایک سو ادارے اور بینک غیر سودی نظام پر کام کر رہے ہیں اور یہ صرف اسلامی ملکوں میں نہیں بلکہ بعض مغربی اور یورپین ممالک میں بھی کام کر رہے ہیں۔ ان بینکوں اور اداروں نے "مشارکہ" کے طریقے پر عمل کرنا شروع کیا ہے۔ اور جہاں کہیں "مشارکہ" کے طریقے کو اپنایا گیا۔ وہاں اس کے بہتر نتائج نکلے ہیں۔ ہم نے پاکستان میں ایک بینک میں اس کا تجربہ کیا۔ اور میں نے خود اس کی "مذہبی نگراں کمیٹی" کے ممبر ہونے کی حیثیت سے اس کا معائنہ کیا۔ اور اس میں "مشارکہ" کے اندر بعض اوقات کھاتہ داروں کو بیس فیصد نفع بھی دیا گیا لہٰذا اگر "مشارکہ" کو وسیع پیمانے پر کیا جائے تو اس کے نتائج اور بھی زیادہ بہتر نکل سکتے ہیں۔

"مشارکت" میں عملی دشواری

لیکن اس میں ایک عملی دشواری ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص مشارکہ کی بنیاد پر بینک سے پیسے لے گیا۔ اور "مشارکہ" کے معنی نفع اور نقصان میں شرکت (Profit and Loss Sharing) کے ہیں کہ اگر نفع ہو گا تو اس میں بھی شرکت ہوگی اور اگر نقصان ہو گا تو اس میں بھی شرکت ہوگی تو افسوس ناک بات یہ ہے کہ خود ہمارے عالم اسلام میں بد دیانتی اتنی عام ہے۔ اور بگاڑ اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اب اگر کوئی شخص اس بنیاد پر بینک سے پیسے لے کر گیا کہ اگر نفع ہوا تو نفع لا کر دوں گا، اور اگر نقصان ہوا تو نقصان بنک کو بھی برداشت کرنا پڑے گا تو وہ پیسے لے کر جانے والا شخص کبھی پلٹ کر نفع لے کر نہیں آئے گا۔ بلکہ وہ ہمیشہ یہ ظاہر کرے گا کہ مجھے نقصان ہوا ہے۔ اور وہ بینک سے کہے گا کہ بجائے اس کے کہ آپ مجھ سے نفع کا مطالبہ کریں۔ بلکہ اس نقصان کی تلافی کے لئے مجھے مزید رقم دیں۔

عملی پہلو کا یہ ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ مگر اس کا تعلق اس "مشارکہ" کے نظام کی خرابی سے نہیں ہے، اور اس کی وجہ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ "مشارکہ" کا نظام خراب ہے۔ بلکہ اس مسئلہ کا تعلق ان انسانوں کی خرابی سے ہے جو اس نظام پر عمل کر رہے ہیں، ان عمل کرنے والوں کے اندر اچھے اخلاق دیانت اور امانت نہیں ہے، اور

اس کی وجہ سے "مشارکہ" کے نظام میں یہ خطرات موجود ہیں کہ لوگ بینک سے "مشارکہ" کی بنیاد پر پیسے لے جائیں گے۔ اور پھر کاروبار میں نقصان دکھا کر بینک کے ذریعہ ڈیپازیٹر کو نقصان پہنچائیں گے۔

اس دشواری کا حل

لیکن یہ مسئلہ کوئی ناقابل حل مسئلہ نہیں ہے اور ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اس کا حل نہ نکالا جاسکے، اگر کوئی ملک اس "مشارکہ" کے نظام کو اختیار کرے تو وہ بآسانی یہ حل نکال سکتا ہے کہ جس کے بارے میں یہ ثابت ہو کہ اس نے بد دیانتی سے کام لیا ہے اور اپنے اکاؤنٹس صحیح بیان (Declare) نہیں کئے، تو حکومت ایک مدت دراز کے لئے اس کو بلیک لسٹ (Black List) کر دے، اور آئندہ کوئی بینک اس کو فائنانسنگ کی کوئی سہولت فراہم نہ کرے اس صورت میں لوگ بد دیانتی کرتے ہوئے ڈریں گے۔ آج بھی جائنٹ اسٹاک کمپنیاں کام کر رہی ہیں، اور وہ اپنے بیلنس شیٹ (Balance She-et) شائع کرتی ہیں۔ اور اس بیلنس شیٹ میں اگرچہ بد دیانتی بھی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں وہ اپنا نفع ظاہر کرتی ہیں۔ اس لئے اگر "مشارکہ" کو پورے ملکی سطح پر اختیار کریں تو اس حل کو اختیار کیا جاسکتا ہے البتہ جب تک "مشارکہ" کو ملکی سطح پر اختیار نہیں کیا جاتا۔ اس وقت تک انفرادی (Individual) اداروں کو "مشارکہ" پر عمل کرنا دشوار ہے، لیکن ایسے انفرادی ادارے سلیکٹڈ (Selected) بات چیت کے ذریعہ مشارکہ کر سکتے ہیں

دوسری متبادل صورت "اجارہ"

اس کے علاوہ اسلام کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسا دین عطا فرمایا ہے کہ اس میں "مشارکہ" کے علاوہ بینکنگ اور فائینانسنگ کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ مثلاً ایک طریقہ اجارہ (Leasing) کا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک شخص بینک سے پیسہ مانگنے آیا، اور بینک نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کس ضرورت کے لئے پیسہ چاہئے؟ اس نے بتایا کہ مجھے اپنے کارخانے میں ایک مشینری باہر سے منگا کر لگانی ہے۔ تو

اب بینک اس شخص کو پیسے نہ دے۔ بلکہ خود اس مشینری کو خرید کر اس شخص کو کرایہ پر دے دے۔ اس عمل کو اجارہ (Leasing) کہا جاتا ہے البتہ آجکل فائینانسنگ اداروں اور بینک میں فائینانشل لینرنگ کا جو طریقہ رائج ہے، وہ شریعت کے مطابق نہیں ہے اس ایگریمنٹ میں بہت سی شقیں (Clauses) شریعت کے خلاف ہیں، لیکن اس کو شریعت کے مطابق آسانی کے ساتھ بنایا جاسکتا ہے، پاکستان میں متعدد فائینانشل ادارے ایسے قائم ہیں جن میں لیزنگ ایگریمنٹ شریعت کے مطابق ہیں، اس کو اختیار کرنا چاہئے۔

تیسری متبادل صورت "مرابحہ"

اسی طرح ایک اور طریقہ ہے، جس کا آپ نے نام سنا ہو گا، وہ ہے "مرابحہ فائینانسنگ" یہ بھی کسی شخص سے معاملہ کرنے کا ایک طریقہ ہے جس میں نفع پر وہ چیز بیچ دی جاتی ہے فرض کیجئے کہ ایک شخص بینک سے اس لئے قرض لے رہا ہے کہ وہ خام مال (Raw Material) خریدنا چاہتا ہے، وہ بینک اس کو خام مال خریدنے کے لئے پیسے دینے کے بجائے وہ خود خام مال خرید کر اس کو نفع پر بیچ دے یہ طریقہ بھی شرعاً جائز ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مرابحہ کی یہ صورت تو ہاتھ گھما کر کان پکڑنے والی بات ہو گئی، کیونکہ اس میں بینک سے نفع لینے کے بجائے دوسرے طریقے سے نفع وصول کر لیا۔ یہ کہنا درست نہیں، اس لئے کہ قرآن کریم نے فرمایا کہ :

" واحل الله البيع وحرم الربا "

(سورۃ البقرۃ ۲۲۵ :

یعنی اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام کیا ہے اور مشرکین مکہ بھی تو یہی کہا کرتے تھے کہ بیع بھی تو ربا جیسی ہے، اس میں بھی انسان نفع کماتا ہے اور ربا میں بھی انسان نفع کماتا ہے، پھر دونوں میں فرق کیا ہے؟ قرآن کریم نے ا نکا ایک ہی جواب دیا کہ یہ ہمارا حکم ہے کہ ربا حرام ہے اور بیع حلال ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ روپیہ کے اوپر روپیہ نہیں لیا جاسکتا، اور روپیہ پر منافع نہیں لیا جاسکتا، لیکن اگر درمیان میں کوئی چیز یا مال

تجارت آجائے۔ اور اس کو فروخت کر کے نفع حاصل کرے اس کو ہم نے حلال قرار دیا ہے، اور مرابحہ کے اندر درمیان میں مال آجاتا ہے اس لئے شریعت کے اعتبار سے وہ سودا (Transaction) جائز ہو جاتا ہے۔

پسندیدہ متبادل کونسا ہے؟

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ مرابحہ اور "لیزنگ (Leasing) مطلوبہ اور پسندیدہ متبادل (Ideal Alternative) نہیں ہیں، اور اس سے تقسیم دولت (Distr-ibution of Wealth) پر کوئی بنیادی اثر نہیں پڑتا۔ البتہ پسندیدہ متبادل "مشارکہ" ہے لیکن آئندہ جو منفرد (Individual) ادارے قائم کئے جائیں، ان کے لئے آزمائشی اور تجرباتی مدت (Transitory Period) میں مرابحہ" اور "لیزنگ" پر بھی عمل کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ اور اس وقت بھی کچھ فائینانشیل انسٹیٹیوشن ان بنیادوں پر کام کر رہے ہیں۔

بہرحال! یہ تو "سود" اور اس کے متعلقات کے بارے میں عام باتیں تھیں جو میں نے عرض کر دیں۔

"سود" سے متعلق ایک مسئلہ اور ہے، جس کی صدائے بازگشت بار بار سنائی دیتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ دارالحرب جہاں غیر مسلم حکومت ہو وہاں سود کے لین دین میں کوئی قباحت نہیں، وہاں غیر مسلم حکومت سے سود لے سکتے ہیں اس مسئلہ پر بھی بہت لمبی چوڑی بحثیں ہوئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ چاہے دارالحرب ہو یا دارالاسلام، جس طرح سود دارالاسلام میں حرام ہے، اسی طرح دار الحرب میں بھی حرام ہے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ عام آدمی کو چاہئے کہ اپنا پیسہ بینک کے اندر کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھے، جہاں پیسوں پر سود نہیں لگتا، لیکن اگر کسی شخص نے غلطی سے سیونگ اکاؤنٹ (Saving Account) میں پیسے رکھ دیئے ہیں اور اس رقم پر سود مل رہا ہے تو پاکستان میں تو ہم لوگوں سے کہہ دیتے ہیں کہ سود کی رقم بینک میں چھوڑ دو، لیکن ایسے ملکوں میں جہاں ایسی رقم اسلام کے خلاف کام پر خرچ ہوتی ہے۔ وہاں اس شخص کو چاہئے کہ وہ سود کی رقم بینک سے وصول کر کے کسی مستحق زکوۃ شخص کو ثواب کی نیت کے

بغیر صرف اپنی جان چھڑانے کے لئے صدقہ کر دے اور خود اپنے استعمال میں نہ لائے۔

عصر حاضر میں اسلامی معیشت کے ادارے

ایک بات اور عرض کر دوں وہ یہ کہ یہ کام نسبتاً ذرا مشکل لگتا ہے، لیکن اس کے باوجود ہم مسلمانوں کو اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہئے کہ ہم خود ایسے مالیاتی ادارے قائم کریں جو اسلامی بنیادوں پر کام کریں اور جیسا کہ میں نے ابھی آپ کے سامنے عرض کیا کہ "مشارکہ" مرابحہ" اور "لیزنگ" کی مکمل اسکیمیں موجود ہیں، اور ان بنیادوں پر مسلمان اپنے ادارے قائم کر سکتے ہیں، اور یہاں کے مسلمان ماشاء اللہ اس بات کو سمجھتے ہیں اور اس میں خود ان کے مسائل کا بھی حل ہے، ان کو چاہئے کو یہاں رہ کر فائنینا نشیل انسٹیٹیوٹ قائم کریں۔ امریکہ میں میرے علم کے مطابق کم از کم ہاؤسنگ کی حد تک دو ادارے موجود ہیں، اور وہ صحیح اسلامی بنیادں پر کام کر رہے ہیں۔ ایک ٹورنٹو میں اور ایک لاس اینجلس میں ہے اب ان اداروں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہئے اور مسلمانوں کو اپنے طور پر ایسے ادارے قائم کرنے چاہئیں لیکن اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ ماہر فقہاء اور مفتی حضرات سے مشورہ کر کے اس کا نظام قائم کریں۔ اور اس سلسلے میں اگر آپ مجھ سے بھی خدمت لینا چاہیں گے تو میں ہر قسم کی خدمت کے لئے حاضر ہوں جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس وقت دنیا میں تقریباً سو ادارے کام کر رہے ہیں۔ اور تقریباً ۵ سال سے میں ان اداروں میں خدمت کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ اور مسلمانوں کے لئے کوئی بہتر راستہ اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین،

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

سُنّت کا مذاق نہ اڑائیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۰/۱-لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب :
مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی
وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب
اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سنت کا مذاق نہ اڑائیں

الحمد للّٰہ نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سيآت اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا اللّٰہ وحده لاشريك له ونشهدان سيدنا وسندنا ومولانا محمداً عبده ورسوله صلى اللّٰہ تعالىٰ عليه وعلىٰ آله وصحبه اجمعين ، وبارك وسلّم تسليماً كثيرًا كثيراً—

اما بعد!

﴿عن أبى أياس سلمة بن عمرو بن الأكوع رضى اللّٰہ تعالىٰ عنه أن رجلاً أكل عند رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلم بشماله، فقال : كُل بيمينكَ قال : لاأستطيع، قال : لااستطعتَ، مامنعه إلا الكبر، فمارفعه إلى فيه﴾

(صحيح مسلم، كتاب الاشربة، باب آداب الطعام)

ذرا سے تکبّر کا نتیجہ

حضرت سلمۃ بن اکوع رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ اہلِ عرب میں بائیں ہاتھ سے کھانا عام تھا اور اکثر لوگ بائیں ہاتھ سے کھاتے تھے۔ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ شخص بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا ہے تو آپ نے اس کو تنبیہ فرماتے ہوئے فرمایا کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔ یہ حکم آپ نے اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں زندگی گزارنے کے جو آداب سکھائے گئے ہیں ان میں داہنی طرف کو بائیں طرف پر ترجیح حاصل ہے۔ اس لئے حضور اقدس صلیٰ اللہ علیہ وسلم ہر معاملے میں داہنی طرف کو بائیں طرف پر ترجیح دیا کرتے تھے۔ یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا ادب ہے۔ چاہے اس کو کوئی مانے یا نہ مانے' چاہے کسی کی عقل اس کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔ بہرحال' حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم سن کر اس شخص نے جواب میں کہا کہ میں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا۔ اور اس جواب دینے کا سبب تکبر تھا اور اس نے سوچا کہ مجھے اس بات پر آپؐ نے ٹوک کر میری توہین کی ہے۔ اس لئے میں حکم نہیں مانتا۔ جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آئندہ تم کبھی دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکو گے اس کے بعد ساری عمر وہ شخص اپنا داہنا ہاتھ منہ تک نہیں لے جا سکا۔

کاش! ہم صحابہؓ کے زمانے میں ہوتے

اس حدیث میں ہمارے لئے کئی عظیم الشّان سبق ہیں۔ پہلا سبق یہ ہے کہ بسا اوقات نادانی اور بیوقوفی کی وجہ سے ہمارے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوتے تو کتنا اچھا

ہوتا۔ صحابہ کرامؓ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی۔ آپ کا دیدار نصیب ہوا۔ اگر ہمیں بھی آپؐ کی صحبت اور دیدار نصیب ہوجاتا اور ہم بھی صحابہؓ کی فہرست میں شامل ہوجاتے تو کتنی اچھی بات تھی اور کبھی کبھی یہ خیال شکوے کی صورت اختیار کرلیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس زمانے میں کیوں پیدا نہیں فرمایا' آج ہمارے لئے پندرہویں صدی میں دین پر چلنا مشکل ہوگیا ہے' ماحول خراب ہوگیا ہے۔ اگر اس زمانے میں ہوتے تو چونکہ ماحول بنا ہوا ہوتا اس لئے اس ماحول میں دین پر چلنا آسان ہوتا۔

اللہ تعالیٰ ظرف کے مطابق دیتے ہیں

ہمارے دل میں یہ خیال تو پیدا ہوتا ہے لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو جو سعادت عطا فرماتے ہیں اس کے ظرف کے مطابق عطا فرماتے ہیں۔ یہ تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ظرف تھا کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے استفادہ بھی کیا اور اس کا حق بھی ادا کیا۔ وہ زمانہ بے شک بڑی سعادتوں کا زمانہ تھا لیکن ساتھ میں بڑے خطرے کا زمانہ بھی تھا۔ آج ہمارے پاس، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات ہیں وہ واسطہ در واسطہ ہوکر ہم تک پہنچے ہیں' اس لئے علماء کرام نے فرمایا کہ جو شخص خبرِ واحد سے ثابت شدہ بات کا انکار کردے اور یہ کہے کہ میں اس بات کو نہیں مانتا تو ایسا شخص سخت گناہ گار ہوگا لیکن کافر نہیں ہوگا۔ منافق نہیں ہوگا' اور اس زمانے میں اگر کسی شخص نے کوئی کلمہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے براہِ راست سنا اور پھر اس کا انکار کیا' تو انکار کرتے ہی کفر میں داخل ہوگیا۔ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایسی ایسی آزمائشیں پیش آئی ہیں کہ یہ انہی کا ظرف تھا کہ ان آزمائشوں کو جھیل گئے۔ خدا جانے اگر ہم ان کی جگہ ہوتے تو نہ جانے کس شمار میں ہوتے۔ اس

ماحول میں جس طرح حضرت صدیقِ اکبر، فاروقِ اعظم، عثمانِ غنی اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم پیدا ہوئے اسی ماحول میں ابوجہل اور ابولہب بھی پیدا ہوئے۔ عبداللہ بن اُبیّ اور دوسرے منافقین بھی پیدا ہوئے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جس شخص کے حق میں جو چیز مقدّر فرمائی ہے وہی چیز اس کے حق میں بہتر ہے۔ لہٰذا یہ تمنّا کرنا کہ کاش ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پیدا ہوتے یہ نادانی کی تمنّا ہے اور معاذ اللہ، یہ اللہ تعالیٰ کی حِکمت پر اعتراض ہے۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ جتنی نعمت عطا فرماتے ہیں وہ اس کے ظرف کے مطابق عطا فرماتے ہیں۔

آپ نے اس کو بَددُعا کیوں دی؟

ایک سوال ذہنوں میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمت للعالمین ہونے کی شان تو یہ تھی کہ کسی سے اپنی ذات کے لئے کبھی انتقام نہیں لیا اور حتی الامکان آپؐ نے لوگوں کے لئے دعا ہی فرمائی۔ بَددُعا نہیں فرمائی۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اس شخص سے وقتی طور پر غلطی ہوگئی اور اس نے یہ کہہ دیا کہ میں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا تو آپ نے فوراً اس کے لئے بددعا کیوں فرمادی کہ آئندہ تمہیں کبھی منہ تک ہاتھ اٹھانے کی توفیق نہ ہو۔ علماءِ کرام نے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ اس شخص نے تکبر کی وجہ سے یہ جھوٹ بول دیا کہ میں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا حالانکہ وہ کھا سکتا تھا۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا اس طرح تکبّر کی وجہ سے جھوٹ بول کر مقابلہ کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی جہنم کا مستحق ہوجاتا ہے۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر شفقت فرماتے ہوئے اور اس کو جہنم کے عذاب سے بچانے کے لئے فوراً اس کے حق میں بُددُعا فرمادی تاکہ اس گناہ پر جو عذاب اس کو ملنا ہے وہ

دنیا ہی کے اندر مل جائے۔ اور اس دنیاوی عذاب کے نتیجے میں ایک طرف تو وہ جہنم کے عذاب سے بچ جائے اور دوسری طرف اس کو عذاب کے بعد عملِ صالح کی توفیق ہو جائے۔ اس حکمت کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں بَددُعا فرمائی۔

بزرگوں کی مختلف شانیں

اسی طرح بعض بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ سے منقول ہے کہ ان کو کسی نے تکلیف دی اور ستایا تو انہوں نے اس سے اسی وقت بدلہ لے لیا۔ وہ حضرات اسی شفقت کی وجہ سے بدلہ لیتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر وہ بدلہ نہ لیں تو اس ستانے والے اور تکلیف دینے والے پر اس سے زیادہ بڑا عذاب نازل ہونے کا اندیشہ ہے۔ ایک صاحب ایک بزرگ کے مرید تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے شیخ سے کہا کہ حضرت! ہم نے سنا ہے کہ بزرگانِ دین اور اولیاء کرام کے رنگ الگ الگ ہوتے ہیں۔ ان کی شانیں الگ الگ ہوتی ہیں، کسی کی کچھ شان ہے، کسی کی کچھ شان ہے، میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کی شانیں کس قسم کی ہوتی ہیں؟ ان کے شیخ نے فرمایا کہ تم اس کے پیچھے مت پڑو۔ اپنے کام میں لگے رہو۔ تم ان کی شانوں کا کہاں ادراک کرسکتے ہو۔ مرید صاحب نے کہا کہ آپ کی بات درست ہے۔ لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے ذرا یہ پتہ لگ جائے کہ بزرگوں کے کیا مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ شیخ نے فرمایا کہ اگر تمہیں دیکھنے پر اصرار ہی ہے تو ایسا کرو کہ فلاں مسجد میں چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں تین بزرگ ذکر کرتے ہوئے، اللہ اللہ کرتے ہوئے ملیں گے۔ تم جاکر ان تینوں کی کمر میں ایک ایک مُکّہ مار دینا اور پھر جو کچھ وہ بزرگ کریں وہ مجھے آکر بتا دینا۔ چنانچہ یہ صاحب اس مسجد میں گئے تو وہاں دیکھا کہ واقعۃً تین بزرگ ذکر میں مشغول ہیں۔ شیخ کے حکم کے مطابق انہوں نے جاکر ایک بزرگ کو پیچھے سے ایک مُکّہ مارا تو انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کس نے مُکّہ مارا، بلکہ اپنے ذکر میں

مشغول رہے۔ اس کے بعد جب دوسرے بزرگ کو ٹکّہ مارا تو وہ پیچھے مڑے۔ اور ان ٹکّہ مارنے والے کا ہاتھ سہلانے لگے اور فرمانے لگے کہ بھائی! تمہیں تکلیف تو نہیں ہوئی؟ چوٹ تو نہیں لگی؟ اور جب تیسرے بزرگ کے ٹکّہ مارا تو انہوں نے پیچھے مڑ کر اتنی ہی زور سے ان کو ٹکّہ مار دیا اور پھر اپنے ذکر میں مشغول ہو گئے۔

یہ صاحب اپنے شیخ کے پاس واپس گئے اور ان سے جاکر عرض کیا کہ حضرت! اس طرح قصّہ پیش آیا کہ جب پہلے بزرگ کو ٹکّہ مارا تو انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اور جب دوسرے کو مارا تو وہ الٹا میرے ہی ہاتھ کو سہلانے لگے۔ اور جب تیسرے بزرگ کو مارا تو انہوں نے مجھ سے بدلہ لیا اور مجھے بھی ایک ٹکّہ مار دیا۔ شیخ نے فرمایا کہ تم یہ پوچھ رہے تھے کہ بزرگوں کی مختلف شانیں کیا ہوتی ہیں تو یہ تین شانیں تم نے علیٰحدہ علیٰحدہ دیکھ لی ہیں۔ ایک شان وہ ہے جو پہلے بزرگ میں تھی۔ انہوں نے یہ سوچا کہ میں تو اللہ کے ذکر میں مشغول ہوں۔ اور اس ذکر میں جو لذت اور مزہ آرہا ہے اس کو چھوڑ کر میں پیچھے کیوں دیکھوں کہ کون مُکّا مار رہا ہے اور اپنا وقت کیوں ضائع کروں۔ دوسرے بزرگ پر مخلوق پر شفقت اور رحمت کی شان غالب تھی۔ اس لئے انہوں نے نہ صرف یہ کہ بدلہ نہیں لیا بلکہ اس مارنے والے کے ہاتھ کو دیکھ رہے ہیں کہ تمہارے ہاتھ میں کوئی چوٹ تو نہیں لگی۔ اور تیسرے بزرگ نے جلدی سے بدلہ اس لئے لے لیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ان کا بدلہ لینے کے لئے اس پر اپنا عذاب نازل فرمادیں۔ اور اس بدلہ لینے سے وہ آخرت کے بدلے سے بھی بچ جائے۔ اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس شخص کے حق میں بَددُعا فرما کر اس شخص کو بڑے عذاب سے بچالیا۔

ہر اچھا کام داہنی طرف سے شروع کریں

بہرحال، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتوں کی تحقیر سے بچنا چاہئے۔

آج کل تو لوگ اس قسم کی سنّتوں کے بارے میں حقارت آمیز انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میاں! ان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں کیا رکھا ہے کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور بائیں ہاتھ سے نہ کھاؤ۔ یاد رکھئے : حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنّت چھوٹی نہیں، چاہے بظاہر دیکھنے میں وہ چھوٹی معلوم ہوتی ہو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم، آپ کی ہر سنّت، آپ کا ہر عمل اس دنیا کے لئے نمونہ ہے۔ چنانچہ آپ نے ہر اچھا کام داہنی طرف سے شروع کرنے کا حکم دیا ہے۔ مثلاً داہنے ہاتھ سے کھاؤ، داہنے ہاتھ سے پانی پیو، اگر مجمع میں کوئی چیز تقسیم کرنی ہے تو داہنی طرف سے شروع کرو۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ : ﴿کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یعجبه التّیمّن فی تنعله وترجله وطهوره فی شانه کله﴾

(صحیح بخاری کتاب الوضو، باب التیمّن فی الوضوء)

یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہر چیز میں داہنے ہاتھ سے ابتداء کرنے کو پسند فرماتے تھے۔ حتی کہ لباس پہننے کے بارے میں فرمایا کہ پہلے داہنی آستین میں ہاتھ ڈالو پھر بائیں آستین میں ہاتھ ڈالو۔ جوتا پہننا ہے تو پہلے دایاں جوتا پہنو اور پھر بایاں جوتا پہنو۔ بالوں میں کنگھی کرنی ہے تو پہلے دائیں طرف کنگھی کرو اور پھر بائیں طرف کرو۔ آنکھوں میں سرمہ ڈالنا ہے تو پہلے داہنی آنکھ میں سرمہ ڈالو پھر بائیں آنکھ میں سرمہ ڈالو۔ ہاتھ دھوتے وقت پہلے دایاں ہاتھ دھو پھر بایاں ہاتھ دھو۔ اس طرح آپ نے ہر چیز میں دائیں طرف سے شروع کرنے کا حکم فرمایا۔

ایک وقت میں دو سنّتوں کا اجتماع

بظاہر یہ معمولی سنتیں ہیں۔ لیکن اگر انسان ان سنتوں پر عمل کرلے تو ہر عمل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبوبیت کا پروانہ مل رہا ہے اور اس پر عظیم اجر وثواب مرتّب ہو رہا ہے۔ اگر انسان محض غفلت اور لاپرواہی سے ان سنتوں کو

چھوڑ دے اور ان پر عمل نہ کرے تو اس سے زیادہ ناقدری اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس لئے اہتمام سے ہر کام انسان دائیں طرف سے شروع کرے۔ حتیٰ کہ بزرگوں نے یہاں تک فرمایا ہے کہ دیکھئے : کہ یہ دو سنتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جب آدمی مسجد سے باہر نکلے تو پہلے بایاں پیر نکالے اور پھر دایاں پیر نکالے۔ اور دوسری سنّت یہ ہے کہ جب جوتا پہنے تو پہلے دائیں پاؤں میں ڈالے پھر بائیں پاؤں میں ڈالے۔ تو ان دونوں سنّتوں کو اس طرح جمع کرے کہ مسجد سے پہلے بایاں پیر نکال کر جوتے کے اوپر رکھ لے اور پھر دایاں پیر نکال کر جوتا پہنے اور پھر بائیں پیر میں جوتا پہنے' اس طرح دونوں سنّتوں پر عمل ہو جائے گا۔

ہر سنّت عظیم ہے

حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے یہاں اس کا امتیاز نہیں تھا کہ کون سی سنّت چھوٹی ہے اور کون سی سنت بڑی ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک ہر سنّت عظیم تھی۔ اس لئے وہ تمام سنّتوں پر عمل کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذرا سا اہتمام کرنے سے انسان کے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا ذخیرہ جمع ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے سنّتوں پر عمل کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

مغربی تہذیب کی ہر چیز الٹی ہے

حضرت قاری محمد طیّب صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ نئی مغربی تہذیب میں پہلی تہذیب کے مقابلے میں ہر چیز الٹی ہے۔ اور پھر مزاحاً فرماتے کہ پہلے چراغ تلے اندھیرا ہوتا تھا اور اب بلب کے اوپر اندھیرا ہوتا ہے۔ اس مغربی تہذیب نے ہماری قدروں کو باقاعدہ اہتمام کرکے بدلا ہے۔ چنانچہ آج کل کی تہذیب یہ ہے کہ کھانا کھاتے وقت کانٹا اور چھری دائیں ہاتھ میں پکڑی جائے اور بائیں ہاتھ سے کھایا جائے۔

آج سے کئی سال پہلے میں ہوائی جہاز میں سفر کر رہا تھا۔ میری ساتھ والی سیٹ پر ایک اور صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ سفر کے دوران ان سے ذرا بے تکلفی بھی ہو گئی تھی، جب کھانا آیا تو ان صاحب نے حسبِ معمول دائیں ہاتھ سے چھری لی اور بائیں ہاتھ سے کھانا شروع کر دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم نے ہر چیز میں انگریز کی تقلید شروع کر رکھی ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت یہ تھی کہ آپ دائیں ہاتھ سے کھاتے تھے اس لئے اگر آپ دائیں ہاتھ سے کھالیں تو آپ کا یہی عمل موجبِ ثواب بن جائے گا۔ وہ جواب میں کہنے لگے کہ اصل میں ہماری قوم اسی وجہ سے پیچھے رہ گئی ہے کہ وہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ان مولویوں نے ان چیزوں کے اندر ہماری قوم کو پھنسا دیا اور ترقی کا راستہ روک دیا اور جو بڑے بڑے کام تھے ان میں ہم پیچھے رہ گئے۔

مغربی دنیا پھر کیوں ترقی کر رہی ہے؟

میں نے ان سے عرض کیا کہ ماشاء اللہ آپ تو مدّتِ دراز سے اس ترقی یافتہ طریقے سے کھا رہے ہیں۔ اس ترقی یافتہ طریقے سے کھانے سے آپ کو کتنی ترقی حاصل ہوئی؟ اور آپ کتنے آگے بڑھ گئے؟ اور کتنے لوگوں پر آپ کو فوقیت حاصل ہو گئی؟ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ پھر میں نے ان کو سمجھایا کہ مسلمانوں کی ترقی اور سربلندی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں پر عمل کرنے میں ہے دوسرے طریقوں پر عمل کرنے میں نہیں۔ اگر مسلمان دوسرے طریقوں کو اختیار کرے گا تو وہ سربلند نہیں ہو سکتا۔ ان صاحب نے کہا کہ آپ نے عجیب بات کہی کہ ترقی سنتوں پر عمل کرنے میں ہے۔ یہ ساری مغربی قومیں کتنی ترقی کر رہی ہیں حالانکہ وہ قومیں الٹے ہاتھ سے کھاتی ہیں۔ سارے کام سنت اور شریعت کے خلاف کرتی ہیں۔ گناہوں کے اندر بری طرح مبتلا ہیں۔ فسق و فجور کے کام کرتی

ہیں۔ شرابیں پیتی ہیں۔ جوا کھیلتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ قومیں ترقی کر رہی ہیں۔ اور پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہیں۔ لہٰذا آپ جو یہ کہتے ہیں کہ سنتوں پر عمل کرنے سے ترقی ہوتی ہے لیکن ہمیں تو نظر آرہا ہے کہ سنّتوں کے خلاف اور شریعت کے خلاف کام کرنے سے دنیا میں ترقی ہو رہی ہے۔

بوجھ بجکڑ کا قصّہ

میں نے ان سے کہا کہ آپ نے یہ جو فرمایا کہ مغربی قومیں سنّتوں کو چھوڑنے کے باوجود ترقی کر رہی ہیں۔ لہٰذا ہم بھی اسی طرح ترقی کر سکتے ہیں۔ اس پر میں نے ان کو ایک قصّہ سنایا۔

وہ یہ کہ ایک گاؤں میں ایک شخص کھجور کے درخت پر چڑھ گیا۔ کسی طرح چڑھ تو گیا لیکن درخت سے اترا نہیں جا رہا تھا، اب اس نے اوپر سے گاؤں والوں کو آواز دی کہ مجھے اتارو۔ اب لوگ جمع ہو گئے اور آپس میں مشورہ کیا کہ کس طرح اس کو درخت سے اتاریں۔ کسی کی سمجھ میں کوئی طریقہ نہیں آرہا تھا۔ اس زمانے میں گاؤں کے اندر ایک بوجھ بجکڑ ہوتا تھا جو سب سے زیادہ عقل مند سمجھا جاتا تھا۔ گاؤں والے اس کے پاس پہنچے اور اس سے جاکر سارا قصّہ سنایا کہ اس طرح ایک آدمی درخت پر چڑھ گیا ہے۔ اس کو کس طرح اتاریں؟ اس بوجھ بجکڑ نے کہا کہ یہ تو کوئی مشکل نہیں، ایسا کرو کہ ایک رسّہ لاؤ۔ اور جب رسّہ لایا گیا تو اس نے کہا کہ اب رسّہ اس شخص کی طرف پھینکو۔ اور اس شخص سے کہا کہ تم اس رسّے کو اپنی کمر سے مضبوطی سے باندھ لو۔ اس نے جب رسّہ باندھ لیا تو اب لوگوں سے کہا تو تم اس رسّے کو زور سے کھینچو، جب لوگوں نے رسّہ کھینچا تو وہ شخص درخت سے نیچے گرا اور مرگیا۔ لوگوں نے اس بوجھ بجکڑ سے کہا کہ آپ نے یہ کیسی ترکیب بتائی۔ یہ تو مرگیا۔ اس نے جواب دیا کہ معلوم نہیں کیوں مرگیا۔ شاید اس کی قضا ہی آگئی تھی۔ اس لئے

مرگیا، ورنہ میں نے اس طریقے سے بے شمار لوگوں کو کنویں سے نکالا ہے اور وہ صحیح سالم نکل آئے۔

مسلمانوں کی ترقی کا راستہ صرف ایک ہے

اس بوجھ بجکڑ نے کھجور کے درخت پر چڑھے شخص کو کنویں کے اندر گرے ہوئے شخص پر قیاس کیا۔ یہی قیاس یہاں بھی کیا جارہا ہے۔ اور یہ کہا جارہا ہے کہ چونکہ غیر مسلم قومیں فسق وفجور اور معصیت اور نافرمانی کے ذریعہ ترقی کررہی ہیں اسی طرح ہم بھی نافرمانیوں کے ساتھ ترقی کرجائیں گے۔ یہ قیاس درست نہیں۔ یاد رکھیں : جس قوم کا نام مسلمان ہے اور جو کلمہ طیبہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پر ایمان لائی ہے وہ اگرچہ سر سے لے کر پاؤں تک ان مغربی اقوام کا طریقہ اپنالے اور اپنا سب کچھ بدل دے تب بھی ساری زندگی کبھی ترقی نہیں کرسکتی۔ ہاں اگر وہ ترقی کرنا چاہتی ہے تو ایک مرتبہ ـــــــ معاذ اللہ ـــــــ اسلام کے چولے کو اپنے جسم سے اتاردے اور یہ کہہ دے کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔ پھر ان کے طریقوں کو اختیار کرلے تو اللہ تعالیٰ انہیں بھی دنیا میں ترقی دے دیں گے۔ لیکن مسلمان کے لئے وہ ضابطہ اور قانون نہیں ہے جو کافروں کے لئے ہے۔ مسلمان کے لئے دنیا میں بھی ترقی کرنے کا اگر کوئی راستہ ہے تو صرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی ترقی کا کوئی راستہ نہیں۔

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اختیار کرلو

بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے دل ودماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ مغربی اقوام جو کام کررہی ہیں وہ قابلِ تقلید ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ـــــــ معاذ اللہ ـــــــ ایک معمولی سی چیز ہے اور قابلِ تقلید نہیں ہے بلکہ ترقی کی راہ میں رُکاوٹ ہے۔ حالانکہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر تم نے

دائیں ہاتھ سے کھانا کھالیا تو تمہاری ترقی میں کون سی رُکاوٹ آجائے گی۔ لیکن ہمارے دل ودماغ پر غلامی مسلّط ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی چھوڑ کر ان کی غلامی اختیار کرلی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غلامی کے اندر جی رہے ہیں اور غلامی کے اندر مر رہے ہیں۔ اور اب اس غلامی سے نکلنا بھی چاہتے ہیں تو نکلا نہیں جاتا۔ نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اس وقت تک اس غلامی سے نہیں نکل سکتے اور اس دنیا میں عزت اور سربلندی حاصل نہیں کرسکتے جب تک ایک مرتبہ صحیح معنی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی قبول نہیں کریں گے اور سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر نہیں چلیں گے۔

سنّت کے مذاق سے کفر کا اندیشہ ہے

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ سنّت صرف انہی چیزوں کا نام نہیں کہ آدمی دائیں ہاتھ سے کھانا کھالے اور دائیں طرف سے کپڑا پہن لے۔ بلکہ زندگی کے ہر شعبے سے سنتوں کا تعلق ہے۔ ان سنتوں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق بھی داخل ہیں۔ آپ لوگوں کے ساتھ کس طرح معاملہ فرماتے تھے؟ کس طرح خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کرتے تھے؟ کس طرح لوگوں کی تکلیفوں پر صبر فرماتے تھے۔ یہ سب باتیں بھی ان سنتوں کا حصّہ ہیں۔ لیکن کوئی سنّت ایسی نہیں ہے جس کو چھوٹا سمجھ کر اس کی تحقیر کی جائے۔ دیکھئے : فرض کریں کہ اگر کسی شخص کو کسی سنّت پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ہورہی ہے تو کم از کم اس شخص کو بہتر سمجھے جس کو اس سنّت پر عمل کرنے کی توفیق ہورہی ہے۔ لیکن اس سنّت کا مذاق اڑانا، اس کی تحقیر کرنا، اس کو بُرا قرار دینا۔ اس پر آوازیں کسنا۔ ان افعال سے اس شخص پر کفر کا اندیشہ ہے۔ اس لئے ادنیٰ سے ادنیٰ سنت کے بارے میں بھی کبھی تحقیر اور تذلیل کا کلمہ زبان سے نہیں نکالنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ

ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

اگلی حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تعلیمات کی ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ :

حضورؐ کی تعلیمات اور اس کو قبول کرنے والوں کی مثال

﴿عن أبی موسیٰ رضی اللہ عنه قال : قال رسول صلی اللہ علیه وسلم : إن مثل مابعثنی اللہ من الهدیٰ والعلم کمثل غیث أصاب أرضاً، فکانت منها طائفة طیبة الخ﴾

(صحیح بخاری– کتاب العلم، باب فضل من علم وعلم)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری مثال اور جن تعلیمات کو میں دے کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک زمین پر بارش ہوئی اور وہ زمین تین قسم کی تھی۔

پہلی قسم کی زمین بڑی زرخیز تھی۔ جب اس پر بارش ہوئی تو اس زمین نے پانی کو جذب کرلیا۔ اور پھر اس زمین میں سے پھول پودے نکل آئے۔

دوسری قسم کی زمین سخت تھی۔ جس کی وجہ سے پانی اندر جذب نہیں ہوا بلکہ اوپر ہی جمع ہوگیا۔ اور پھر اس پانی سے بہت سے انسانوں نے اور جانوروں نے فائدہ اٹھایا۔

تیسری قسم کی زمین میں نہ تو اُگانے کی صلاحیت تھی۔ اور نہ پانی کو اوپر جمع کرنے کی صلاحیت تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بارش کا پانی اس پر برسا اور وہ پانی بے فائدہ چلا گیا۔

لوگوں کی تین قسمیں

پھر فرمایا کہ اسی طرح میں جو تعلیمات لے کر آیا ہوں وہ بارش کی طرح ہے اور ان تعلیمات کو سننے والے تین طرح کے لوگ ہیں۔ بعض لوگ وہ ہیں جنہوں نے ان تعلیمات کو اپنے اندر جذب کر کے اس سے فائدہ اٹھایا اور اس کے نتیجے میں ان کے اعمال اور اخلاق درست ہوگئے اور وہ اچھے انسان بن گئے۔ اور لوگوں کے لئے ایک بہترین نمونہ بن گئے۔ اور دوسرے لوگ وہ ہیں جنہوں نے میری تعلیمات کو حاصل کیا۔ پھر خود بھی اس سے فائدہ اٹھایا اور دوسرے لوگوں کے فائدے کے لئے اس کو جمع کرلیا۔ اور پھر وہ ان تعلیمات کو تعلیم، تدریس، وعظ اور دعوت کے ذریعہ دوسروں تک پہنچا رہے ہیں۔ تیسرے قسم کے لوگ وہ ہیں جنہوں نے میری تعلیمات کو ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا، نہ ان سے خود فائدہ اٹھایا اور نہ ان کے ذریعہ دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔

اس حدیث کے ذریعہ اس بات کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا کہ میری تعلیمات کے بارے میں دو باتوں میں سے ایک بات اختیار کرلو۔ یا تو خود اس سے فائدہ اٹھاؤ اور دوسروں کو بھی اس کے ذریعہ فائدہ پہنچاؤ۔ یا کم از کم خود اس سے فائدہ اٹھالو۔ اس لئے کہ تیسرا راستہ بربادی کا ہے۔ وہ یہ ہے کہ میری تعلیمات سن کر اس کو پسِ پُشت ڈال دو۔ اسی بات کو ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا کہ :

﴿كُنْ عالماً أو متعلّماً ولا تكن ثالثاً فتهلك﴾

یعنی یا تو تم دین کے عالم بن جاؤ کہ خود بھی عمل کرو اور دوسروں تک پہنچاؤ یا اس علمِ دین کے سیکھنے والے بن جاؤ۔ کوئی تیسری صورت اختیار مت کرو ورنہ تم ہلاک اور برباد ہو جاؤ گے۔

دوسروں کو دین کی دعوت دیں

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں اور تعلیمات کے بارے میں ایک مسلمان کا اصل فریضہ یہ ہے کہ وہ خود اس پر عمل کرے اور دوسروں تک اس کو پہنچائے۔ اگر خود عمل کرلیا اور دوسروں تک نہیں پہنچایا تو صرف یہ نہیں ہوگا کہ ناقص رہے گا بلکہ اس نے خود جو نفع حاصل کیا ہے اس کے بھی ہاتھ سے جاتے رہنے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے کہ اگر اس کا اپنا ماحول درست نہیں ہوگا تو وہ کسی بھی وقت پھسل جائے گا۔ مثلاً ایک شخص دین دار بن گیا۔ نماز پابندی سے پڑھنے لگا۔ احکامات پر عمل کرنے لگا۔ گناہوں سے خود بچنے لگا۔ لیکن اپنے گھر والوں کی اصلاح کی فکر نہ کی اور گھر کے سب افراد اس کے خلاف ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا وہ ایک نہ ایک دن اس راستے سے پھسل جائے گا۔ اس لئے اس شخص کے ذمہ فرض ہے کہ اپنے گھر والوں پر بھی محنت کرتا رہے' ان کو بھی محبت' پیار اور شفقت سے اس راستے کی طرف لانے کی کوشش کرتا رہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب تک بھی بات پہنچانے کی فکر کرتا رہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: ﴿المؤمن مرآة المؤمن﴾

(ابو داود، کتاب الادب، باب فی النصیحۃ)

"ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا آئینہ ہے"۔

یعنی ایک مسلمان کو کسی غلطی کی طرف توجہ نہیں ہو رہی ہے تو دوسرا مسلمان اس کو محبت اور پیار سے اس غلطی کی طرف توجہ دلائے۔ البتہ اس میں ایسا طریقہ اختیار نہ کرے جو دل آزار ہو۔ جس سے دل کو ٹھیس لگے اور جس سے نفرت پیدا ہو۔ بعض لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہم بہت سمجھاتے ہیں لیکن فائدہ نہیں ہوتا تو یاد رکھئے! فائدہ ہونا یا نہ ہونا یہ تمہارا کام نہیں' تمہارا کام تو صرف اپنا فریضہ انجام دینا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو دیکھئے۔ ساڑھے نو سو

سال تک تبلیغ کرتے رہے اور صرف انیس (۱۹) آدمی مسلمان ہوئے۔ ان کا حوصلہ اور جگر گردہ دیکھئے کہ اس کے باوجود تبلیغ ودعوت کا کام نہیں چھوڑا۔

دعوت سے اُکتانا نہیں چاہئے

لہٰذا ایک داعی اور مبلّغ کا کام یہ ہے کہ وہ گھبرائے نہیں۔ اکتائے نہیں۔ مایوس نہ ہو۔ بلکہ ان سے کہتا رہے اور اس کے درپے بھی نہ ہو کہ میری بات کا تو ان پر کوئی اثر نہیں ہوا لہٰذا اب آئندہ ان کو کہنے سے کیا فائدہ؟ بلکہ موقع بموقع مختلف انداز سے اپنی بات پہنچاتا رہے۔ یاد رکھئے! اچھی بات کسی نہ کسی وقت ضرور اپنا اثر دکھاتی ہے اور اس کے اثرات ضرور ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اگر بالفرض کسی کے مقدر میں ہدایت نہیں ہے جیسے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے مقدر میں ہدایت نہیں تھی تو بھی تمہارا اس کو دعوت دینا خود تمہارے حق میں فائدہ مند ہے۔ اور اس پر تمہارے لئے اجر وثواب لکھا جارہا ہے۔ اور خود بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں اور تعلیمات پر عمل کرنے کی کوشش کرتا رہے اور جو کوتاہی ہوجائے اس پر استغفار کرتا رہے اور معافی مانگتا رہے۔ ساری عمر یہ کرتا رہے تو انشاء اللہ بیڑا پار ہوجائے گا۔ البتہ غفلت بہت بُری چیز ہے۔ اس غفلت سے بچنے کی کوشش کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی غفلت سے حفاظت فرمائے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

تقدیر پر راضی رہنا چاہئے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : یکم رجولائی ۱۹۹۵ء

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیر پر راضی رہنا چاہئے

الحمدلله نحمده ونستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيات اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادی له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريک له ونشهدان سيدنا وسندنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى اله واصحابه وبارک وسلم تسليمًا كثيرًا كثيرا۔

اما بعد!

﴿عن ابی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: احرص على ماينفعک واستعن بالله ولا تعجز، وان اصابک شيئی فلا تقل لوانی فعلتُ لكان كذا وكذا، ولكن قل: قدّر الله وماشاء فعل، فان "لو" تفتح عمل الشيطان﴾

(مسلم شريف كتاب القدر، باب فی الامر بالقوة وترک العجز)

دنیا کی حرص مت کرو

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان کاموں کی حرص کرو جو تم کو نفع پہنچانے والے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ وہ اعمال اور وہ افعال جو آخرت میں نفع کا سبب بن سکتے ہیں ان کے اندر حرص کرو۔

دیکھئے! ویسے تو حرص بُری چیز ہے اور اس سے منع فرمایا گیا ہے کہ مال کی حرص، دنیا کی حرص، شہرت کی حرص، نام و نمود کی حرص، دولت کی حرص مت کرو اور انسان کے لئے یہ بہت بڑا عیب ہے کہ وہ ان چیزوں کی حرص کرے بلکہ ان تمام چیزوں میں قناعت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے جو کچھ تمہیں جائز طریقے سے کوشش کرنے کے نتیجے میں مل رہا ہے اس پر قناعت کرو اور یہ سمجھو کہ میرے لئے یہی بہتر تھا۔ مزید کی حرص کرنا کہ مجھے اور زیادہ مل جائے، یہ درست نہیں اور اس حرص سے بچو، کیونکہ دنیا میں کوئی بھی شخص اپنی ساری خواہشات کبھی پوری نہیں کر سکتا۔ "کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد"۔ بڑے سے بڑا بادشاہ، بڑے سے بڑا سرمایہ دار ایسا نہیں ملے گا جو یہ کہہ دے کہ میری ساری خواہشات پوری ہو گئی ہیں۔ بلکہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ابن آدم کو ایک وادی سونے کی بھر کر مل جائے تو وہ یہ چاہے گا کہ دو مل جائیں۔ اور جب دو مل جائیں گی تو پھر خواہش کرے گا کہ تین ہو جائیں۔ اور ابن آدم کا پیٹ سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ جب قبر میں جائے گا تو قبر کی مٹی اس کا پیٹ بھرے گی، دنیا کے اندر کوئی چیز اس کا پیٹ نہیں بھرے گی۔ البتہ ایک چیز ہے جو اس کا پیٹ بھر سکتی ہے۔ وہ ہے "قناعت" یعنی جو کچھ اس کو اللہ تعالیٰ نے جائز اور حلال طریقے سے دے دیا ہے، اس پر قناعت کرلے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اس کے سوا پیٹ بھرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

دین کی حرص پسندیدہ ہے

لہٰذا دنیا کی چیزوں میں حرص کرنا بُرا ہے اور اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن دین کے کاموں میں، اچھے اعمال میں، عبادات میں حرص کرنا اچھی چیز ہے۔ مثلاً کوئی شخص نیک کام کر رہا ہے اس کو دیکھ کر یہ حرص کرنا کہ میں بھی یہ نیک کام کروں۔ یا فلاں شخص کو دین کی نعمت حاصل ہے مجھے بھی یہ نعمت حاصل ہو جائے۔ ایسی حرص مطلوب

ہے اور محبوب اور پسندیدہ ہے۔ اس لئے اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسے کاموں کی حرص کرو جو آخرت میں نفع دینے والے ہیں۔ اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فاستبقوا الخیرات یعنی نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اور آپس میں مسابقت کرو۔

حضراتِ صحابہؓ اور نیک کاموں کی حرص

حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نیکیوں میں بڑے حریص تھے اور ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح ہمارے نامۂ اعمال میں نیکی کا اضافہ ہو جائے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے تو انہوں نے ان کو یہ حدیث سنائی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> "اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی نماز جنازہ میں شریک ہو تو اس کو ایک قیراط اجر ملتا ہے۔ اور اگر اس کے دفن میں بھی شریک رہے تو اس کو دو قیراط ملتے ہیں"۔

"قیراط" اس زمانے میں سونے کا ایک مخصوص وزن ہوتا تھا۔ آپ نے سمجھانے کے لئے قیراط کا لفظ بیان فرمادیا، پھر خود ہی فرمایا کہ آخرت کا وہ قیراط اُحد پہاڑ سے بھی بڑا ہوگا۔ مطلب یہ تھا کہ قیراط سے دنیا والا قیراط مت سمجھ لینا بلکہ آخرت والا قیراط مراد ہے جو اپنی عظمت شان کے لحاظ سے اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ اور یہ بھی اس اجر کا پورا بیان نہیں ہے۔ اس لئے کہ پورا بیان تو انسان کی قدرت میں بھی نہیں ہے کیونکہ انسان کی لغت اس کے بیان کے لئے ناکافی ہے۔ اس واسطے یہ الفاظ استعمال فرمائے۔ تاکہ ہماری سمجھ میں آجائے۔ بہرحال، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جب یہ حدیث سنی تو حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ کیا واقعۃً آپ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ

عنہ نے فرمایا کہ میں نے خود یہ حدیث سنی ہے۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: افسوس! ہم نے اب تک بہت سے قیراط ضائع کردیئے۔ اگر پہلے سے یہ حدیث سنی ہوتی تو ایسے مواقع کبھی ضائع نہ کرتے۔ تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا یہی حال تھا کہ وہ اس بات کے حریص تھے کہ کسی طرح کوئی نیکی ہمارے نامۂ اعمال میں بڑھ جائے۔

یہ حرص پیدا کریں

ہم اور آپ وعظوں میں سنتے رہتے ہیں کہ فلاں عمل کا یہ ثواب ہے، فلاں عمل کا یہ ثواب ہے۔ یہ درحقیقت اس لئے بیان کئے جاتے ہیں تاکہ ہمارے دلوں میں ان اعمال کو انجام دینے کی حرص پیدا ہو۔ فضیلت والے اعمال، نوافل، مستحبات اگرچہ فرض و واجب نہیں۔ لیکن ایک مسلمان کے دل میں ان کی حرص ہونی چاہئے کہ وہ ہمیں حاصل ہوجائیں۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ دین کی حرص عطا فرماتے ہیں تو ان کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح کوئی نیکی ہمارے نامۂ اعمال میں بڑھ جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دوڑ لگانا

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک دعوت میں تشریف لے جارہے تھے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی ساتھ تھیں۔ پیدل سفر تھا۔ راستے میں ایک جنگل اور میدان پڑتا تھا، اور بے پردگی کا احتمال نہیں تھا اس لئے کہ وہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ اے عائشہ! کیا میرے ساتھ دوڑ لگاؤ گی؟ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ ہاں! دوڑ لگاؤں گی۔ اس دوڑ لگانے سے ایک طرف تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دلجوئی مقصود تھی اور دوسری طرف

امّت کو یہ تعلیم دینی تھی کہ بہت زیادہ بزرگ اور نیک ہو کر ایک کونے میں بیٹھ جانا بھی اچھی بات نہیں۔ بلکہ دنیا میں آدمیوں کی طرح اور انسانوں کی طرح رہنا چاہئے۔ اور ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ساتھ دو مرتبہ دوڑ لگائی۔ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے اور دوسری مرتبہ جب دوڑ لگائی تو چونکہ اس وقت آپ کا جسم نسبۃً بھاری ہو گیا تھا اس لئے میں آگے نکل گئی اور آپ پیچھے رہ گئے۔ اس وقت آپ نے فرمایا: "تلک بتلک" یعنی دونوں برابر ہو گئے۔ ایک مرتبہ تم جیت گئیں اور ایک مرتبہ میں جیت گیا۔ اب دیکھئے کہ بزرگانِ دین اس سُنّت پر کس طرح عمل کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ کا اس سُنّت پر عمل

ایک مرتبہ حضرت حکیم الأمت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ تھانہ بھون سے کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں میں دعوت میں تشریف لے جارہے تھے اور اہلیہ محترمہ ساتھ تھیں۔ جنگل کا پیدل سفر تھا، کوئی اور شخص بھی ساتھ نہیں تھا۔ جب جنگل کے درمیان پہنچے تو خیال آیا کہ الحمد للہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی سنّتوں پر عمل کرنے کی توفیق ہو گئی ہے لیکن اہلیہ کے ساتھ دوڑ لگانے کی سُنّت پر ابھی تک عمل کا موقع نہیں ملا۔ آج موقع ہے کہ اس سُنّت پر بھی عمل ہو جائے۔ چنانچہ اس وقت آپ نے دوڑ لگا کر اس سُنّت پر بھی عمل کر لیا۔ اب ظاہر ہے کہ دوڑ لگانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت پر عمل کرنے کے لئے دوڑ لگائی۔ یہ ہے اتباعِ سُنّت کی حرص۔ نیک کاموں کی حرص۔ اجر و ثواب حاصل کرنے کی حرص۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے اندر یہ حرص پیدا فرمادے۔ آمین۔

ہمت بھی اللہ سے مانگنی چاہئے

اب بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں ایک نیک کام کرنے کا شوق پیدا ہوا اور دل چاہا کہ فلاں شخص یہ عبادت کرتا ہے، میں بھی یہ عبادت انجام دوں۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ یہ عبادت اور یہ نیک کام ہمارے بس میں نہیں ہے، ہم نہیں کرپائیں گے، یہ تو بڑے لوگوں کا کام ہے۔ تو جب اس قسم کا خیال دل میں پیدا ہو تو اس وقت کیا کریں؟ اس کے لئے حدیث کے اگلے جملے میں ارشاد فرمایا کہ:

﴿واستعن بالله ولا تعجز﴾

یعنی ایسے وقت میں مایوس اور عاجز ہو کر نہ بیٹھ جائے کہ مجھ سے یہ عبادت ہو ہی نہیں سکتی بلکہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرے۔ اور کہے کہ یا اللہ! یہ کام میرے بس میں تو نہیں ہے۔ لیکن آپ کی قدرت میں ہے۔ آپ ہی مجھے اس نیک کام کی توفیق عطا فرمادیں اور اس کے کرنے کی ہمت عطا فرمادیں۔

مثلاً نیک لوگوں کے بارے میں سنا کہ وہ رات کو اٹھ کر تہجد پڑھا کرتے ہیں اور رات کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں۔ تو اب دل میں شوق پیدا ہوا کہ مجھے بھی رات کو اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھنی چاہئے۔ لیکن یہ خیال بھی آیا کہ رات کو اٹھ کر تہجد پڑھنا میرے بس میں نہیں۔ چلو چھوڑو اور مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے بلکہ اللہ تعالیٰ سے کہے کہ یا اللہ! میری آنکھ نہیں کھلتی، میری نیند پوری نہیں ہوتی۔ یا اللہ! تہجد پڑھنے کی توفیق عطا فرمادیجئے اور اس کی فضیلت عطا فرمادیجئے۔

یا عمل کی توفیق یا اجر وثواب

کیونکہ جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا اور توفیق مانگے گا تو پھر دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو واقعۃً اللہ تعالیٰ اس عمل کی توفیق عطا فرمادیں گے۔ اور اگر اس عمل کی توفیق حاصل

نہ ہوئی تو یقیناً اس نیک عمل کا ثواب انشاء اللہ ضرور حاصل ہو جائے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے شہادت طلب کرے اور یہ کہے کہ یا اللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت نصیب فرما، تو اللہ تعالیٰ اس کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمادیتے ہیں۔ اگرچہ بستر پر ہی اس کا انتقال ہو جائے۔

ایک لوہار کا واقعہ

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا جب انتقال ہو گیا تو کسی نے خواب میں ان کو دیکھا تو پوچھا کہ حضرت! کیسی گزری؟ جواب میں انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے کرم کا معاملہ فرمایا اور مغفرت فرمادی اور استحقاق کے بغیر بڑا درجہ عطا فرمایا۔ لیکن جو درجہ میرے سامنے والے مکان میں رہنے والے لوہار کو نصیب ہوا وہ مجھے نہیں مل سکا۔ جب خواب دیکھنے والا بیدار ہوا تو اس کو یہ جستجو ہوئی کہ یہ معلوم کروں کہ وہ کون لوہار تھا اور کیا عمل کرتا تھا؟ جس کی وجہ سے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آگے بڑھ گیا۔ چنانچہ وہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے محلّے میں گیا اور پوچھا کہ یہاں کوئی لوہار رہتا تھا جس کا انتقال ہو گیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ہاں، اس سامنے والے مکان میں ایک لوہار رہتا تھا۔ اور چند روز پہلے اس کا انتقال ہوا ہے۔ چنانچہ یہ لوہار کے گھر گیا اور اس کی بیوی سے اپنا خواب بیان کیا اور پوچھا کہ تمہارا شوہر ایسا کون سا عمل کرتا تھا جس کی وجہ سے وہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے آگے بڑھ گیا؟ لوہار کی بیوی نے بتایا کہ میرا شوہر ایسی کوئی خاص عبادت تو نہیں کرتا تھا۔ سارا دن لوہا کوٹتا رہتا تھا۔ البتہ میں نے اس کے اندر دو باتیں دیکھیں۔ ایک یہ کہ جب لوہا کوٹنے کے دوران اذان کی آواز "اللہ اکبر" کان میں پڑتی تو فوراً اپنا کام بند کردیتا تھا۔ حتیٰ کہ اگر اس نے اپنا ہتھوڑا کوٹنے کے لئے اوپر اٹھالیا ہوتا اور اتنے میں اذان کی آواز آجاتی تو وہ یہ بھی گوارا نہیں کرتا تھا کہ اس ہتھوڑے سے چوٹ لگادوں۔

بلکہ ہتھوڑے کو پیچھے کی طرف پھینک دیتا اور اٹھ کر نماز کی تیاری میں لگ جاتا۔ دوسری بات میں نے یہ دیکھی کہ ہمارے سامنے والے مکان میں ایک بزرگ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ رہا کرتے تھے۔ وہ رات بھر اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرا شوہر یہ کہا کرتا تھا کہ یہ اللہ کے نیک بندے ساری رات عبادت کرتے ہیں۔ کاش اللہ تعالیٰ مجھے بھی فراغت عطا فرماتے تو میں بھی عبادت کرتا ـــــــ یہ جواب سن کر اس شخص نے کہا کہ بس یہی حسرت ہے جس نے ان کو حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے آگے بڑھادیا ـــــــ میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ قصہ سنا کر فرمایا کرتے تھے کہ: یہ ہے "حسرت نایاب" جو بعض اوقات انسان کو کہاں سے کہاں پہنچادیتی ہے ـــــــ اس لئے جب کسی کے بارے میں سنو کہ فلاں شخص یہ نیک عمل کرتا ہے تو اس نیک عمل کے بارے میں دل میں حرص اور حسرت پیدا ہونی چاہئے کہ کاش ہمیں بھی اس نیک کام کے کرنے کی توفیق مل جائے۔

حضراتِ صحابہؓ کرام کی فکر اور سوچ کا انداز

حدیث شریف میں آتا ہے کہ بعض صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ، ہمیں یہ فکر ہے کہ ہمارے بہت سے ساتھی دولت مند اور مال دار ہیں۔ ان پر ہمیں رشک آتا ہے۔ اس لئے کہ جو جسمانی عبادت ہم کرتے ہیں۔ وہ بھی کرتے ہیں۔ لیکن جسمانی عبادت کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی کرتے ہیں، مثلاً صدقہ خیرات کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں اور ان کے درجات بھی بلند ہوتے ہیں۔ لہٰذا آخرت کے درجات میں وہ ہم سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور ہم جتنی بھی کوشش کرلیں لیکن غریب ہونے کی وجہ سے ان سے آگے نہیں بڑھ سکتے، اس لئے کہ ہم صدقہ خیرات نہیں کرسکتے ـــــــ دیکھئے، ہماری اور ان کی سوچ میں کتنا فرق ہے، ہم

جب اپنے سے بڑے مالدار کے بارے میں سوچتے ہیں تو اس کے صدقہ خیرات کرنے پر ہمیں رشک نہیں آتا، بلکہ اس بات پر رشک آتا ہے کہ اس کے پاس دولت زیادہ ہے۔ اس لئے یہ بہت مزے سے زندگی گزار رہا ہے، کاش کہ ہمیں بھی دولت مل جائے تو ہم بھی عیش و آرام سے زندگی گزاریں۔ یہ ہے سوچ کا فرق۔

بہرحال، ان صحابہ کرام کے سوال کے جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں ایک ایسا عمل بتاتا ہوں کہ اگر تم اس عمل کو پابندی سے کرلو گے تو صدقہ خیرات کرنے والوں سے تمہارا ثواب بڑھ جائے گا،کوئی تم سے آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ وہ عمل یہ ہے کہ ہر نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ "سبحان اللہ"، ۳۳ مرتبہ "الحمدللہ"، ۳۴ مرتبہ "اللہ اکبر" پڑھ لیا کرو۔

نیکی کی حرص عظیم نعمت ہے

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہی ذکر مال داروں نے بھی شروع کردیا تو پھر ان صحابہ کرام کا سوال برقرار رہے گا۔ کیونکہ مالدار لوگ پھر ان سے آگے بڑھ جائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتلانا چاہتے تھے کہ جب تمہیں یہ حرص اور حسرت ہو رہی ہے کہ ہم بھی مالدار ہوتے تو ہم بھی اسی طرح صدقہ خیرات کرتے جس طرح یہ مال دار لوگ کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ اس حرص کی برکت سے تم کو صدقہ خیرات کا اجر وثواب بھی عطا فرمادیں گے ـــــــ بہرحال، کسی نیک کام کے کرنے کی حرص اور ارادہ اور اس کے نہ کرسکنے کی حسرت بھی بڑی نعمت ہے۔ اس لئے جب کسی شخص کے بارے میں سنو کہ فلاں شخص یہ نیک عمل کرتا ہے تو تم یہ دعا کرلو کہ اے اللہ! یہ نیک کام میرے بس سے باہر ہے۔ آپ ہی اس کام کے کرنے میں میری مدد فرمایئے، اور مجھے اس کے کرنے کی توفیق عطا فرمایئے، تو پھر اللہ تعالیٰ یا تو اس نیک کام کے کرنے کی توفیق عطا فرمادیں گے۔ یا اس نیک کام کا اجر وثواب عطا فرمادیں گے۔ یہ نسخہ کیمیا ہے۔

لفظ "اگر" شیطانی عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے

آگے فرمایا کہ:

﴿ وان اصابک شیئی فلا تقل لوأنی فعلت لکان کذا وکذا ولکن قل قدر اللہ وماشاء فعل، فان "لو" تفتح عمل الشیطان ﴾

یعنی اگر دنیاوی زندگی میں تمہیں کوئی مصیبت اور تکلیف پہنچے تو یہ مت کہو کہ اگر یوں کر لیتا تو ایسا نہ ہوتا۔ اور اگر یوں کر لیتا تو ایسا ہو جاتا، یہ اگر مگر مت کہو، بلکہ یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور مشیّت یہی تھی۔ جو اللہ نے چاہا وہ ہو گیا، اس لئے کہ یہ لفظ "اگر" شیطان کے عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے ــــــ مثلاً کسی کے عزیز کا انتقال ہو جائے تو کہتا ہے کہ اگر فلاں ڈاکٹر سے علاج کرالیتا تو یہ بچ جاتا، یا مثلاً کسی کے ہاں چوری ہو گئی، یا ڈاکہ پڑ گیا تو یہ کہتا ہے کہ اگر فلاں طریقے سے حفاظت کر لیتا تو چوری نہ ہوتی وغیرہ۔ ایسی باتیں مت کہو، بلکہ یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں ایسا ہی ہونا مقدر تھا، اس لئے ہو گیا، میں اگر ہزار تدبیر کر لیتا تب بھی ایسا ہی ہوتا۔

دنیا راحت اور تکلیف سے مرکّب ہے

اس حدیث میں کیا عجیب و غریب تعلیم دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں یہ بات اتار دے۔ آمین۔ یقین رکھیئے کہ اس دنیا میں سکون، عافیت، آرام اور اطمینان حاصل کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ انسان تقدیر پر یقین اور ایمان لے آئے۔ اس لئے کہ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کو اس دنیا میں کبھی کوئی غم اور پریشانی نہ آئی ہو۔ یا کبھی کوئی مصیبت اس کے اوپر نہ آئی ہو۔ یہ عالم دنیا دونوں چیزوں سے مرکب ہے، جس میں خوشی بھی ہے، غم بھی ہے، راحت بھی ہے اور تکلیف بھی ہے۔ یہاں کوئی خوشی بھی خالص نہیں، کوئی غم خالص نہیں۔ لہٰذا غم، تکلیف اور پریشانی تو اس دنیا میں ضرور آئے گی، اگر ساری دنیا کی دولت خرچ کر کے یہ چاہو کہ کوئی تکلیف

نہ آئے تو یہ نہیں ہو سکتا۔

اللہ کے محبوب پر تکالیف زیادہ آتی ہیں

ہماری اور تمہاری کیا حقیقت ہے۔ انبیاء علیہم السلام جو اللہ تعالیٰ کی پیاری اور محبوب مخلوق ہے۔ ان کے اوپر بھی تکالیف اور پریشانیاں آتی ہیں۔ اور عام لوگوں سے زیادہ آتی ہیں۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الأمثل فالأمثل﴾

(کنزالعمال، حدیث نمبر ٦٧٨٣)

یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ تکالیف انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں۔ اور پھر جو شخص انبیاء علیہم السلام سے جتنا قریب ہو گا اس کو اتنی ہی زیادہ تکالیف اور پریشانیاں آئیں گی۔ وہ عالم جہاں کوئی پریشانی اور تکلیف نہیں آئے گی، وہ عالم جنت ہے، ـــــ لہٰذا اس دنیا میں پریشانیاں تو آئیں گی، لیکن اگر ان تکالیف پر یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ہائے یہ کیوں ہوا؟ اگر ایسا کر لیتے تو یہ نہ ہوتا۔ فلاں وجہ اور سبب کے ایسا ہو گیا۔ ایسا سوچنے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس سے حسرت بڑھتی ہے، تکلیف اور صدمہ بڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر شکوہ پیدا ہوتا ہے کہ معاذ اللہ ـــــ یہ ساری مصیبتیں میرے مقدر میں رہ گئی تھیں، وغیرہ۔ اور وہ مصیبت وبال جان بن جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی تکلیف ہوئی اور اس شکوہ کی وجہ سے آخرت میں اس پر عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات ایمان بھی خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

حقیر کیڑا مصلحت کیا جانے

اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ جب تمہیں کوئی پریشانی یا تکلیف آئے تو یہ سمجھو کہ جو کچھ پیش آیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے سے پیش آیا ہے۔ میں اس کی حکمت کیا جانوں، اللہ تعالیٰ ہی اسکی حکمت اور مصلحت جانتے

ہیں۔ ایک حقیر کیڑا اس کی حکمت اور مصلحت کو کیا جانے ــــــ البتہ اس تکلیف پر رونا آئے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بعض لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ تکلیف پر رونا نہیں چاہئے۔ یہ بات غلط ہے، اس لئے کہ تکلیف پر رونا بُرا نہیں ہے۔ بشرطیکہ اللہ تعالیٰ سے اس مصیبت پر شکوہ نہ ہو۔

ایک بزرگ کا بھوک کی وجہ سے رونا

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک صاحب ان سے ملنے گئے، دیکھا کہ وہ بیٹھے رو رہے ہیں۔ ان صاحب نے پوچھا کہ حضرت کیا تکلیف ہے؟ جس کی وجہ سے آپ رو رہے ہیں؟ ان بزرگ نے جواب دیا کہ بھوک لگ رہی ہے۔ اس شخص نے کہا کہ آپ کوئی بچے ہیں کہ بھوک کی وجہ سے رو رہے ہیں۔ بھوک کی وجہ سے تو بچے روتے ہیں۔ آپ تو بڑے ہیں۔ پھر بھی رو رہے ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا: تمہیں کیا معلوم، اللہ تعالیٰ کو میرا رونا دیکھنا ہی مقصود ہو۔ اس وجہ سے وہ مجھے بھوکا رکھ رہے ہیں ــــــ تو بعض اوقات اللہ تعالیٰ کو رونا بھی پسند آتا ہے، بشرطیکہ اس کے ساتھ شکوہ شکایت نہ ہو ــــــ اسی کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں "تفویض" کہا جاتا ہے۔ یعنی معاملہ اللہ کے سپرد کردینا اور یہ کہنا کہ اے اللہ۔ مجھے ظاہری طور پر تکلیف ہو رہی ہے۔ لیکن فیصلہ آپ کا برحق ہے ــــــ اگر انسان کو اس بات کا یقین حاصل ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے کے بغیر ایک پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا اور تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں تو اس یقین کے بعد اطمینان اور سکون حاصل ہو جائے گا اور بیماری اور پریشانی کے وقت جو ناقابل برداشت صدمہ اور تکلیف ہوتی ہے وہ نہیں ہوگی۔

مسلمان اور کافر کا امتیاز

ایک کافر کا عزیز بیمار ہوا۔ اس نے ڈاکٹر سے علاج کرایا، ڈاکٹر کے علاج کے دوران

اس کا انتقال ہو گیا، تو اب اس کافر کے پاس اطمینان حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، کیونکہ وہ تو یہی سمجھے گا کہ ڈاکٹر نے دوا صحیح تجویز نہیں کی، صحیح دیکھ بھال نہیں کی، اس لئے یہ مر گیا۔ اگر علاج صحیح ہو جاتا تو یہ نہ مرتا ـــــ لیکن ایک مسلمان کا عزیز بیمار ہو گیا، ڈاکٹر نے علاج کیا، لیکن اس کا انتقال ہو گیا تو اب اس مسلمان کے پاس اطمینان اور سکون حاصل کرنے کا ذریعہ موجود ہے، وہ یہ کہ اگرچہ اس کی موت کا ظاہری سبب ڈاکٹر کی غفلت ہے، لیکن جو کچھ ہوا، یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوا، ان کے ارادے سے موت واقع ہوئی، اگر ڈاکٹر صحیح دوا دیتا، تب بھی وہ دوا الٹی پڑ جاتی۔ اور اگر میں اس ڈاکٹر کے علاوہ دوسرے ڈاکٹر کے پاس جاتا، تب بھی موت آتی۔ اس لئے کہ ہونا وہی تھا جو تقدیر میں اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا تھا۔ اس کی موت کا وقت آچکا تھا۔ اس کے دن پورے ہو گئے تھے، اس کو تو جانا تھا، اس لئے چلا گیا، اللہ تعالیٰ کی تقدیر برحق ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں آگ کا کوئی انگارہ اپنی زبان پر رکھ لوں اور اس کو چاٹوں، یہ عمل مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں کسی ایسے واقعہ کے بارے میں جو ہو چکا، یہ کہوں کہ کاش! یہ واقعہ نہ ہوتا، اور کسی ایسے واقعہ کے بارے میں جو نہیں ہوا، یہ کہوں کہ کاش! وہ واقعہ ہو جاتا۔

اللہ کے فیصلے پر راضی رہو

مقصد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بات کا فیصلہ فرمادیں، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق کوئی واقعہ پیش آجائے تو اب اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ یا یہ کہنا کہ ایسا ہو جاتا، یہ کہنا اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہونے کے خلاف ہے۔ ایک مؤمن سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اور اس کے فیصلے پر راضی رہے، اور اس تقدیر کے فیصلے پر اس کے دل میں شکایت پیدا نہ ہو، اور نہ دل میں اس کی بُرائی ہو۔ بلکہ دل و جان سے اس پر راضی رہے ـــــ ایک اور حدیث میں حضرابو الدرداء

رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

﴿اذا قضی اللہ قضاءً أحب أن یرضی بقضاءہٖ﴾

یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی کام کے بارے میں فیصلہ فرمادیتے ہیں کہ یہ کام اس طرح انجام دیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ میرا بندہ اس فیصلے پر راضی ہو۔ اور اس فیصلے کو بے چوں چرا تسلیم کرے۔ یہ نہ کہے کہ یوں ہوتا تو اچھا تھا۔ فرض کریں کہ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جو طبیعت کو ناگوار ہے اور وہ غم اور تکلیف کا واقعہ ہے۔ اب پیش آچکنے کے بعد یہ کہنا کہ اگر یوں کرلیتے تو یہ واقعہ پیش نہ آتا۔ ایسا کہنے سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ اس لئے کہ جو واقعہ پیش آیا، وہ تو پیش آنا ہی تھا۔ اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور اس کی تقدیر تھی۔ تم اگر ہزار تدبیر بھی کرلیتے۔ تب بھی وہ فیصلہ ٹلنے والا نہیں تھا۔ لہٰذا اب فضول یہ باتیں کرنا کہ ایسا کرلیتے تو ایسا ہوجاتا۔ یہ باتیں اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کے منافی ہیں۔ ایسی باتیں کرنا مؤمن کا کام نہیں۔

رضاء بالقضاء میں تسلّی کا سامان ہے

حقیقت میں اگر غور کرکے دیکھا جائے تو انسان کے پاس (رضابالقضاء) تقدیر پر راضی ہونے کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے؟ اس لئے کہ تمہارے ناراض ہونے سے وہ فیصلہ بدل نہیں سکتا جو غم پیش آیا ہے، تمہاری ناراضگی سے وہ غم دور نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس ناراضگی سے غم کی شدّت اور تکلیف میں مزید اضافہ ہوجائے گا اور یہ کہے گا کہ ہائے ہم نے یہ نہ کرلیا۔ فلاں تدبیر اختیار نہ کرلی ـــــــ اگر غور کرکے دیکھا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ رضابالقضاء میں درحقیقت انسان کی تسلّی کا سامان ہے۔ اور ایک مؤمن کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو تسلّی کا ذریعہ بنادیا ہے۔

تقدیر "تدبیر" سے نہیں روکتی

اور یہ "تقدیر" عجیب وغریب عقیدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب ایمان کو عطا فرمایا ہے۔ اس عقیدہ کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ طرح طرح کی غلطیوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں ـــــــ پہلی بات یہ ہے کہ کسی واقعہ کے پیش آنے سے پہلے تقدیر کا عقیدہ کسی انسان کو بے عملی پر آمادہ نہ کرے۔ مثلاً ایک انسان تقدیر کا بہانہ کرکے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور یہ کہے کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ میں کچھ نہیں کرتا۔ یہ عمل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ جس چیز کے حاصل کرنے کی جو تدبیر ہے۔ اس کو اختیار کرو۔ اس کے اختیار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑو۔

تدبیر کے بعد فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو

دوسری بات یہ ہے کہ تقدیر کے عقیدے پر عمل کسی واقعہ کے پیش آنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی واقعہ پیش آچکا، تو ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ یہ سوچے کہ میں نے جو تدبیریں اختیار کرنی تھیں وہ کرلیں اور اب جو واقعہ ہماری تدبیر کے خلاف پیش آیا، وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے ہم اس پر راضی ہیں ـــــــ لہٰذا واقعہ پیش آچکنے کے بعد اس پر بہت زیادہ پریشانی، بہت زیادہ حسرت اور تکلیف کا اظہار کرنا اور یہ کہنا کہ فلاں تدبیر اختیار کرلیتا تو یوں ہوجاتا۔ یہ بات عقیدہ تقدیر کے خلاف ہے ـــــــ ان دو انتہاؤں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے ہمیں راہ اعتدال یہ بتادی کہ جب تک تقدیر پیش نہیں آئی، اس وقت تک تمہارا فرض ہے کہ اپنی سی پوری کوشش کرلو۔ اور احتیاطی تدابیر بھی اختیار کرلو، اس لئے کہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ تقدیر میں کیا لکھا ہے؟

حضرت فاروق اعظمؓ کا ایک واقعہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ شام کے دورے پر تشریف لے جارہے تھے۔ راستے میں آپ کو اطلاع ملی کہ شام کے علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی ہے ـــــ یہ اتنا سخت طاعون تھا کہ انسان بیٹھے بیٹھے چند گھنٹوں میں ختم ہوجاتا تھا۔ اس طاعون میں ہزار ہا صحابہ کرامؓ شہید ہوئے ہیں۔ آج بھی اردن میں حضرت عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے مزار کے پاس پورا قبرستان ان صحابہ کرامؓ کی قبروں سے بھرا ہوا ہے جو اس طاعون میں شہید ہوئے ـــــ بہرحال، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ وہاں جائیں یا نہ جائیں اور واپس چلے جائیں۔ اس وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث سنائی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر کسی علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑے تو جو لوگ اس علاقے سے باہر ہیں وہ اس علاقے کے اندر داخل نہ ہوں، اور جو لوگ اس علاقے میں مقیم ہیں۔ وہ وہاں سے نہ بھاگیں ـــــ یہ حدیث سن کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس حدیث میں آپ کا صاف صاف ارشاد ہے کہ ایسے علاقے میں داخل نہیں ہونا چاہئے۔ لہٰذا آپ نے وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کردیا ـــــ اس وقت ایک صحابی غالباً حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ تھے، انہوں نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

﴿أتفرّ من قدر الله؟﴾

کیا آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے اس طاعون کے ذریعہ موت کا آنا لکھ دیا ہے تو وہ موت آکر رہے گی۔ اور اگر تقدیر میں موت نہیں لکھی تو جانا اور نہ جانا برابر ہے۔ جواب میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

﴿لو غیرک قالها یا أبا عبیده﴾

اے ابو عبیدہؓ اگر آپ کے علاوہ کوئی شخص یہ بات کہتا تو میں اس کو معذور سمجھتا، لیکن آپ تو پوری حقیقت سے آگاہ ہیں آپ یہ کیسے کہہ رہے ہیں کہ تقدیر سے بھاگ رہا ہوں۔ پھر فرمایا کہ:

﴿نعم نفر من قدر الله الی قدر الله﴾

"ہاں! ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں"۔

مطلب یہ تھا کہ جب تک واقعہ پیش نہیں آیا، اس وقت تک ہمیں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حکم ہے۔ اور ان احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنا عقیدہ تقدیر کے خلاف نہیں، بلکہ عقیدہ تقدیر کے اندر داخل ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے کہ احتیاطی تدابیر اختیار کرو، چنانچہ اس حکم پر عمل کرتے ہوئے واپس جا رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر تقدیر میں ہمارے لئے طاعون کی بیماری میں مبتلا ہونا لکھا ہے تو اس کو ہم ٹال نہیں سکتے۔ لیکن اپنی سی تدبیر ہمیں پوری کرنی ہے۔

"تقدیر" کا صحیح مفہوم

یہ ہے ایک مؤمن کا عقیدہ کہ اپنی طرف سے تدبیر پوری کی، لیکن تدبیر کرنے کے بعد معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ یا اللہ، ہمارے ہاتھ میں جو تدبیر تھی وہ تو ہم نے اختیار کرلی۔ اب معاملہ آپ کے اختیار میں ہے، آپ کا جو فیصلہ ہوگا۔ ہم اس پر راضی رہیں گے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا ——— لہٰذا واقعہ کے پیش آنے سے پہلے عقیدہ تقدیر کسی کو بے عملی پر آمادہ نہ کرے۔ جیسے بعض لوگ عقیدہ تقدیر کو بے عملی کا بہانہ بنالیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ لہٰذا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔ کام کیوں کریں؟ یہ درست نہیں، کیونکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اپنی تدبیر کرتے رہو۔ ہاتھ پاؤں ہلاتے رہو۔ لیکن ساری تدابیر

اختیار کرنے کے بعد اگر واقعہ اپنی مرضی کے خلاف پیش آجائے تو اس پر راضی رہو لیکن اگر تم اپنی رضامندی کا اظہار نہ کرو، بلکہ یہ کہہ دو کہ یہ فیصلہ تو بہت غلط ہوا، بہت بُرا ہوا تو اس کا نتیجہ سوائے پریشانی میں اضافے کے کچھ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ جو واقعہ پیش آچکا ہے۔ وہ بدل نہیں سکتا، اور آخر کار تمہیں سر تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا۔ اس لئے پہلے دن ہی اس کو تسلیم کرلینا چاہئے کہ جو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے ہم اس پر راضی ہیں۔

غم اور صدمہ کرنا "رضابالقضاء" کے منافی نہیں

اب ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے۔ وہ یہ کہ جیسا کہ میں پہلے عرض کیا تھا کہ اگر کوئی تکلیف دہ واقعہ پیش آئے، یا کوئی غم یا صدمہ پیش آئے تو اس غم اور تکلیف پر رونا صبر کے منافی اور خلاف نہیں۔ اور گناہ نہیں ـــــ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ غم اور صدمہ کرنا اور اس کا اظہار کرنا جائز ہے۔ رونا بھی جائز ہے۔ اور دوسری طرف آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہئے۔ یہ دونوں چیزیں کیسے جمع کریں کہ ایک طرف فیصلے پر راضی بھی ہوں اور دوسری طرف غم اور صدمہ کا اظہار بھی کرنا جائز ہو؟ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ غم اور صدمہ کا اظہار الگ چیز ہے۔ اور اللہ کے فیصلے پر راضی ہونا الگ چیز ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ عین حکمت پر مبنی ہے، اور ہمیں اس کی حکمت معلوم نہیں، اور حکمت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے دل کو تکلیف پہنچ رہی ہے۔ اس لئے غم اور صدمہ بھی ہے اور اس غم اور صدمہ کی وجہ سے ہم رو بھی رہے ہیں۔ اور آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ برحق ہے۔ حکمت پر مبنی ہے۔ لہٰذا "رضا" سے مراد رضاء عقلی ہے۔ یعنی عقلی طور پر انسان یہ سمجھے کہ یہ فیصلہ صحیح ہے۔

ایک بہترین مثال

مثلاً ایک مریض ڈاکٹر سے آپریشن کرانے کے لئے ہسپتال جاتا ہے، اور ڈاکٹر سے درخواست کرتا ہے، اور اس کی خوشامد کرتا ہے کہ میرا آپریشن کردو۔ جب ڈاکٹر نے آپریشن شروع کیا تو اب یہ رو رہا ہے۔ چیخ رہا ہے۔ ہائے ہائے کررہا ہے۔ اور اس تکلیف کی وجہ سے اس کو رنج اور صدمہ بھی ہورہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ڈاکٹر کو آپریشن کی فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ وہ عقلی طور پر جانتا ہے کہ جو کچھ ڈاکٹر کررہا ہے، وہ ٹھیک کررہا ہے، اور میرے فائدے کے لئے کررہا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک مؤمن کو اس دنیا میں جتنی تکلیفیں اور جتنے صدمے پہنچتے ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچتے ہیں۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ تمہارا آپریشن کررہے ہیں۔ اب اگر ان تکالیف کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کررہے ہو تو اس کا انجام تمہارے حق میں بہتر ہونے والا ہے ——— لہٰذا عقلی طور پر اگر یہ بات دل میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اور پھر انسان اس صدمے پر اور اس تکلیف پر اظہار غم کرے۔ روئے، چلائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

کام کا بگڑنا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ایک تاجر شخص اس بات کی کوشش میں لگا ہوتا ہے کہ میرا فلاں سودا ہوجائے تو اس کے ذریعہ میں بہت نفع کمالوں گا۔ یا ایک شخص کسی عہدے اور منصب کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ مجھے فلاں منصب مل جائے تو بڑا اچھا ہو، اب اس سودے کے لئے یا اس منصب کے لئے بھاگ دوڑ اور کوشش کررہا ہے، دعائیں کررہا ہے، دوسروں سے بھی دعائیں کرارہا ہے، لیکن جب سب کام مکمل ہوچکے، اور قریب تھا کہ وہ سودا ہوجائے۔ یا وہ عہدہ اور منصب اس کو مل جائے، عین اس وقت اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ

میرا یہ نادان اور بیوقوف بندہ اس سودے کے یا منصب کے حاصل کرنے کے پیچھے پڑا ہوا ہے، اور اپنی پوری کوشش صرف کر رہا ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر یہ سودا یا یہ منصب اس کو حاصل ہو گیا تو مجھے اس کو جہنم میں ڈالنا پڑے گا، اس لئے کہ اس سودے یا اس عہدے کے نتیجے میں یہ گناہ میں مبتلا ہو گا۔ اور اس کے نتیجے میں مجھے اس کو جہنم میں دھکیلنا پڑے گا۔ اس لئے یہ منصب یہ سودا اس سے دور کر دیا جائے، چنانچہ عین اس وقت جب کہ وہ سودا ہونے والا تھا۔ یا وہ عہدہ ملنے ہی والا تھا کہ اچانک کوئی رکاوٹ کھڑی ہو گئی۔ اور وہ سودا نہیں ہوا۔ یا وہ عہدہ نہیں ملا۔ اب یہ شخص رو رہا ہے اور یہ شکایت کر رہا ہے کہ فلاں شخص نے بیچ میں آکر میرا کام بگاڑ دیا۔ اور اب اس بگاڑ کو دوسروں کی طرف منسوب کر رہا ہے۔ حالانکہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ جو کچھ کیا وہ اس کے خالق اور مالک نے کیا ہے۔ اور اس کے فائدے کے لئے کیا، کیونکہ اگر یہ عہدہ مل جاتا تو جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوتا —— یہ ہے تقدیر اور اللہ کا فیصلہ جس پر عقلی طور پر انسان کو راضی رہنا چاہئے۔

تقدیر کے عقیدے پر ایمان لاچکے ہو

عقیدہ کے اعتبار سے تو ہر مؤمن کا تقدیر پر ایمان ہوتا ہے۔ جب ایک بندہ ایمان لاتا ہے تو اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لانے کے ساتھ وہ تقدیر پر بھی ایمان لاتا ہے:

﴿آمنت بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر والقدر خيره وشره من الله تعالىٰ﴾

لیکن اس ایمان کا اثر عموماً اس کی زندگی پر ظاہر نہیں ہوتا اور اس عقیدے کا استحضار نہیں رہتا۔ اور اس کی طرف دھیان نہیں رہتا۔ جس کی وجہ سے وہ دنیا میں پریشان ہوتا رہتا ہے، اس لئے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ جب تم اس عقیدے پر ایمان لے آئے تو اس عقیدے کو اپنی زندگی کا جزو بناؤ، اور اس عقیدے کا دھیان پیدا کرو، اور اس کو یاد رکھو، اور جو بھی واقعہ پیش آئے اس وقت اس کو تازہ کرو کہ میں اللہ کی

تقدیر پر ایمان لایا تھا، اسلئے مجھے اس پر راضی رہنا چاہئے۔ یہی فرق ہے ایک عام آدمی میں اور اس شخص میں جس نے صوفیاء کرام کی زیر تربیت اس عقیدے کو اپنی زندگی میں اپنانے کی کوشش کی ہو ـــــ لہٰذا اس عقدے کو اس طرح حال بنالیں کہ جب کبھی کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو اس وقت "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھے۔ اور ساتھ میں اللہ تعالیٰ کے حوالے کردے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے، آگے ہمیں اس کے اندر چوں وچرا کرنے کی گنجائش نہیں ـــــ اس کی مشق کرنی پڑتی ہے۔ تب جاکر یہ عقیدہ حال بن جاتا ہے۔ اور جب یہ حال بن جاتا ہے تو پھر ایسے شخص کو دنیا میں کبھی پریشانی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اس عقیدے کو ہم سب کا حال بنادے۔ آمین

یہ پریشانی کیوں ہے؟

دیکھئے، صدمہ اور غم اور چیز ہے یہ تو ہر شخص کو پیش آتی ہیں۔ لیکن ایک ہے پریشانی، وہ یہ کہ آدمی اس غم اور صدمہ کی وجہ سے بے تاب اور بے چین ہے۔ کسی کروٹ چین نہیں آرہا ہے یہ پریشانی کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ شخص اس فیصلے پر عقلی طور پر راضی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کو چین اور سکون کیسے میسر آئے؟ ـــــ اور جس شخص کا اس بات پر ایمان ہے کہ میرے اختیار میں جو کچھ تھا وہ میں نے کرلیا۔ اب آگے میرے اختیار سے باہر تھا۔ اس لئے میں کچھ نہیں کرسکتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ برحق ہے، ایسے شخص کو کبھی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ غم اور صدمہ ضرور ہوگا۔ لیکن پریشانی نہیں ہوگی۔

آب زر سے لکھنے کے قابل جملہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو مجھے اس پر بہت شدید صدمہ ہوا، زندگی میں اتنا بڑا صدمہ کبھی پیش نہیں آیا تھا، اور یہ صدمہ بے چینی کی حد تک پہنچا ہوا تھا، کسی کروٹ کسی حال قرار نہیں آرہا تھا اور اس

صدمہ پر رونا بھی نہیں آرہا تھا۔ اس لئے کہ بعض اوقات رونے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے ــــــ اس وقت میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبد الحئی صاحب قدس اللہ سرہ کو اپنی یہ کیفیت لکھی تو انہوں نے جواب میں صرف ایک جملہ لکھ دیا اور الحمدللہ آج تک وہ جملہ دل پر نقش ہے اور اس ایک جملے نے اتنا فائدہ پہنچایا کہ میں بیان نہیں کرسکتا، وہ جملہ یہ تھا:

"صدمہ تو اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن غیر اختیاری امور پر اتنی زیادہ پریشانی قابل اصلاح ہے"۔

یعنی صدمہ تو اپنی جگہ ہے، وہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ عظیم باپ سے جدائی ہوگئی۔ لیکن یہ ایک غیر اختیاری واقعہ پیش آیا، اس لئے تم یہ نہیں کرسکتے تھے کہ موت کے وقت کو ٹلا دیتے۔ اب اس غیر اختیاری واقعے پر اتنی پریشانی قابل اصلاح ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ رضا بالقضاء کا جو حکم ہے۔ اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور اس پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے پریشانی ہو رہی ہے ــــــ یقین جانئے اس ایک جملے کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے سینے پر برف رکھ دی۔ اور میری آنکھیں کھول دیں۔

لوح دل پر یہ "جملہ" نقش کرلیں

ایک اور موقع پر اپنے دوسرے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے خط میں لکھا کہ حضرت! فلاں بات کی وجہ سے سخت پریشانی ہے۔ جواب میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جملۃ لکھا کہ:

"جس شخص کا اللہ جل جلالہ سے تعلق ہو، اس کا پریشانی سے کیا تعلق؟"

یعنی پریشانی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہو تو پھر پریشانی آنے کی مجال نہیں ــــــ اس لئے کہ

جو صدمہ اور غم ہو رہا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے کہو، یا اللہ اس کو دور فرمادیں اور پھر اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرمائیں اس پر راضی رہو۔ لیکن پریشانی کس بات کی؟ لہٰذا اگر رضا بالقضاء حال بن جائے اور جسم و جان کے اندر داخل ہو جائے تو پھر پریشانی کا گزر نہیں ہو سکتا۔

حضرت ذوالنون مصریؒ کے راحت و سکون کا راز

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے جاکر پوچھا کہ حضرت کیا حال ہے؟ فرمایا: بڑے مزے میں ہوں۔ اور اس شخص کے مزے کا کیا پوچھتے ہو کہ اس کائنات میں کوئی واقعہ اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا۔ بلکہ جو واقعہ بھی پیش آتا ہے وہ اس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ لہٰذا دنیا کے سارے کام میری مرضی کے مطابق ہو رہے ہیں ـــــ سوال کرنے والے نے کہا کہ حضرت! یہ بات تو انبیاء علیہم السلام کو بھی حاصل نہیں ہوئی کہ دنیا کے تمام کام ان کی مرضی کے مطابق ہو جائیں۔ آپ کو یہ کیسے حاصل ہوئی؟ جواب میں فرمایا کہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔ جو اللہ کی مرضی، وہ میری مرضی، اور دنیا کے سارے کام اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ اور میری بھی وہی مرضی ہے۔ اور جب سارے کام میری مرضی سے ہو رہے ہیں تو میرے مزے کا کیا پوچھنا۔ پریشانی تو میرے پاس بھی نہیں بھٹکتی، پریشانی تو اس شخص کو ہو جس کی مرضی کے خلاف کام ہوتے ہوں۔

تکالیف بھی حقیقت میں رحمت ہیں

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو رضا بالقضاء کی دولت عطا فرمادیتے ہیں۔ ان کے پاس پریشانی کا گزر نہیں ہوتا ـــــ ان کو صدمہ ضرور ہوتا ہے۔ غم اور تکلیف ان کے پاس ضرور آتی ہے۔ لیکن پریشانی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ غم یا صدمہ آرہا ہے، وہ میرے مالک کی طرف سے آرہا ہے۔ اور میرے مالک کی حکمت

کے مطابق آرہا ہے، اور میرے مالک کی تقدیر کے مطابق میرا فائدہ بھی اسی میں ہے۔ حتیٰ کہ بعض بزرگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یعنی یہ بات تمہارے دشمن کو نصیب نہ ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو اس پر اپنا خنجر ازمائے ـــــ یعنی یہ جو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں۔ یہ بھی ان کی رحمت کا عنوان ہے۔ اور جب ان کی رحمت کا عنوان ہے تو دوسروں کو کیوں پہنچیں، یہ بھی ہمیں پہنچیں۔

ایک مثال

حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ اس کی ایک مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک شخص آپ کا محبوب ہے۔ اس سے آپ کو انتہاء درجہ کی محبت ہے اور اس محبوب کے دور ہونے کی وجہ سے بہت عرصہ سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اچانک وہ محبوب آپ کے پاس آتا ہے، اور چپکے سے آکر آپ کو پیچھے سے پکڑ کر زور سے دبالیتا ہے۔ اور اتنی زور سے دباتا ہے کہ پسلیاں ٹوٹنے کے قریب ہونے لگتی ہیں، اور آپ کو تکلیف ہوتی ہے جس کے نتیجے میں آپ چیختے اور چلاتے ہیں اور اپنے کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں تمہارا فلاں محبوب ہوں۔ اگر تمہیں میرا یہ دبانا پسند نہیں ہے تو میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں اور تمہارے رقیب کو دبالیتا ہوں۔ اگر تم عاشق صادق ہو تو یہی جواب دو گے کہ میرے رقیب کو مت دبانا۔ بلکہ مجھے ہی دباؤ اور زور سے دباؤ۔ اور یہ شعر پڑھو گے کہ ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں یہ ادراک عطا فرمادے کہ یہ تکلیفیں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا عنوان ہیں۔ لیکن ہم چونکہ کمزور ہیں۔ اس لئے ہم ان تکالیف کو مانگتے نہیں، لیکن جب وہ تکلیف آگئی تو ان کی حکمت اور فیصلے سے آئی ہے، اس لئے وہ ہمارے حق میں بہتر ہے۔

تکلیف مت مانگو، لیکن آئے تو صبر کرو

ہمارے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ ہم ان تکالیف کو مانگیں، لیکن جن کو ان تکالیف کی حقیقت کا ادراک ہوتا ہے، وہ بعض اوقات مانگ بھی لیتے ہیں، چنانچہ بعض صوفیاء کرام سے مانگنا منقول ہے، خاص کر وہ تکلیف جو دین کے راستے میں پہنچے اس کو تو عاشقان صادق نے ہزارہا تکالیف پر مقدم اور افضل قرار دیا۔ اس کے بارے میں یہ شعر کہا کہ ؎

بجرم عشق تو کشد عجب غوغائیسیت
تو غیر برسر جام آکہ خوش تماشائیسیت

یعنی تیرے عشق کے جرم میں لوگ مجھے مار رہے ہیں، اور گھسیٹ رہے ہیں۔ اور ایک شور برپا ہے، آکر دیکھ کہ تماشے کا کیسا شاندار منظر ہے ——— یہ تو بڑے لوگوں کی بات ہے لیکن ہم لوگ چونکہ کمزور ہیں۔ طاقت اور قوت اور صلاحیت نہیں ہے۔ اس لئے ان تکالیف کو اللہ تعالیٰ سے مانگتے نہیں ہیں۔ بلکہ عافیت مانگتے ہیں کہ یا اللہ عافیت عطا فرمایئے، اور جب تکلیف آجاتی ہے تو اس کے ازالے کی بھی دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! یہ تکلیف اگرچہ آپ کی نعمت ہے، لیکن ہماری کمزوری پر نظر کرتے ہوئے اس نعمت کو عافیت کی نعمت سے بدل دیجئے لیکن پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ اس کا نام "رضا

بالقضاء" ہے۔ تقدیر پر ایمان تو سب کا ہوتا ہے کہ جو کچھ تقدیر میں لکھا تھا وہ ہوگیا۔ لیکن اس عقیدے کو اپنی زندگی کا حال بنانا چاہئے۔ "حال" بنانے کے بعد انشاء اللہ پریشانی پاس نہیں بھٹکے گی۔

اللہ والوں کا حال

چنانچہ آپ نے اللہ والوں کو دیکھا ہوگا کہ ان کو آپ کبھی بے تاب اور بے چین اور پریشان نہیں پائیں گے۔ ان کے ساتھ کیسا ہی بڑے سے بڑا ناگوار واقعہ پیش آجائے۔ اس پر ان کو غم تو ہوگا۔ لیکن بے تابی اور بے چینی اور پریشانی ان کے پاس بھی نہیں بھٹکتی۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ اس پر راضی رہنا ضروری ہے۔ لہٰذا انسان کی زندگی میں جب بھی کوئی ناگوار واقعہ پیش آجائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ خیال کرتے ہوئے اس پر راضی رہنے کی فکر کرے۔ غم، صدمہ اور پریشانی کا یہی علاج ہے۔ اور ایسا کرنے سے اس کو اعلیٰ درجہ کا صبر حاصل ہوجائے گا اور صبر وہ اعلیٰ عبادت ہے جو ساری عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿انما یوفی الصّٰبرون اجرھم بغیر حساب﴾

"یعنی اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرمائیں گے"۔

کوئی شخص تکلیف سے خالی نہیں

ہر تکلیف کے موقع پر یہ سوچنا چاہئے کہ اس کائنات میں کوئی ایسا شخص ہو نہیں سکتا جس کو اپنی زندگی میں کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچی ہو۔ چاہے وہ بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، بڑے سے بڑا سرمایہ دار اور دولت مند ہو، بڑے سے بڑا صاحب منصب ہو، بڑے سے بڑا نیک، ولی اللہ ہو، بڑے سے بڑا نبی ہو۔ لہٰذا تکلیف تو تمہیں ضرور پہنچے گی۔ تم چاہو تو بھی پہنچے گی اور نہ چاہو تو بھی پہنچے گی۔ اس لئے کہ یہ دنیا ایسی جگہ ہے جہاں راحت

بھی ہے، غم بھی ہے، خوشی ہے، پریشانی بھی ہے۔ خالص راحت بھی کسی کو حاصل نہیں۔ خالص غم بھی کسی کو میسر نہیں۔ یہ طے شدہ بات ہے۔ حتی کہ خدا کا انکار کرنے والوں نے خدا کے وجود کا انکار کر دیا۔ (العیاذ باللہ) لیکن اس بات سے انکار نہیں کر سکے کہ اس دنیا میں کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ جب یہ بات طے شدہ ہے کہ تکلیف پہنچنی ہے تو اب سوال یہ ہے کہ کون سی تکلیف پہنچے اور کون سی تکلیف نہ پہنچے۔ اس کا ایک راستہ تو یہ ہے کہ تم خود فیصلہ کر لو کہ مجھے فلاں تکلیف پہنچے اور فلاں تکلیف نہ پہنچے۔ کیا تمہارے اندر اس بات کی طاقت ہے کہ تم یہ فیصلہ کرو کہ فلاں تکلیف میرے حق میں بہتر ہے اور فلاں تکلیف بہتر نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ تم نہیں جانتے کہ کون سی تکلیف کا انجام میرے حق میں بہتر ہو گا اور کون سی تکلیف کا انجام بہتر نہیں ہو گا۔ لہٰذا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دو، اور یہ کہہ دو کہ یا اللہ! آپ اپنے فیصلے کے مطابق جو تکلیف دینا چاہیں وہ دے دیجئے اور پھر اس کو برداشت کرنے کی طاقت بھی دے دیجئے اور اس پر صبر بھی عطا فرمائیے۔

چھوٹی تکلیف بڑی تکلیف کو ٹال دیتی ہے

انسان بے چارہ اپنی عقل کے دائرے میں محدود ہے، اس کو یہ پتہ نہیں کہ جو تکلیف مجھے پہنچی ہے اس نے مجھے کسی بڑی تکلیف سے بچالیا ہے۔ مثلاً کسی شخص کو بخار آگیا، تو اب اس کو بخار کی تکلیف نظر آرہی ہے، یا کوئی شخص کسی ملازمت کے لئے کوشش کر رہا تھا، لیکن وہ ملازمت اس کو نہیں ملی۔ اس کو یہ تکلیف نظر آرہی ہے۔ یا گھر میں سامان کی چوری ہو گئی۔ اس کو یہ تکلیف نظر آرہی ہے۔ لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ اگر یہ تکلیف نہ پہنچتی تو دوسری کون سی تکلیف پہنچتی؟ اور وہ تکلیف بڑی تھی یا یہ تکلیف بڑی ہے؟ چونکہ اس کو اس کا علم نہیں ہے۔ اس لئے جو تکلیف اس کو پہنچی ہے تو اس کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اس کا ذکر اور چرچا کرتا رہتا ہے کہ ہائے مجھے یہ تکلیف پہنچ گئی، بلکہ اس موقع پر انسان یہ سوچے کہ اچھا ہوا کہ اس چھوٹی سی تکلیف

پر بات ٹل گئی۔ ورنہ خدا جانے کتنی بڑی مصیبت آتی۔ کیا بلا نازل ہوتی۔ یہ سوچنے سے انسان کو تسلی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ انسان کو دکھا بھی دیتے ہیں کہ جس مصیبت کو تم بڑی تکلیف سمجھ رہے تھے۔ دیکھو وہ کیسی رحمت ثابت ہوئی۔

اللہ سے مدد مانگو

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری تسلی کے لئے یہ دعا بھی تلقین فرمادی کہ:

﴿لا ملجا ولا منجا من الله الا اليه﴾

اللہ تعالیٰ سے بچاؤ کا سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں کہ اسی کی آغوش رحمت میں پناہ لو، یعنی اس کے فیصلے پر راضی رہو، اور پھر اسی سے مدد مانگو، یا اللہ، اس کو دور فرمادیجئے، اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتے ہیں کہ ایک تیر انداز تصور کرو، جس کے پاس اتنی بڑی تیر کمان ہے جس نے ساری کائنات کو گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ اور اس کمان کے ہر ہر حصے میں تیر لگے ہوئے ہیں، اور دنیا میں کوئی جگہ ایسی محفوظ نہیں ہے۔ جس جگہ پر وہ تیر نہ پہنچ سکتے ہوں۔ پوری دنیا کا چپہ چپہ اس کی زد میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسے تیر انداز کے تیروں سے بچنے کی کیا صورت ہے؟ کون سی جگہ ایسی ہے جہاں پر جاکر ان تیروں سے بچا جاسکے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تم تیروں سے بچنا چاہتے ہو تو اس تیز انداز کے پہلو میں جاکر کھڑے ہو جاؤ، اس کے علاوہ کوئی اور جگہ بچاؤ کی نہیں ہے ——— اسی طرح یہ مصائب، یہ حوادثات، یہ پریشانیاں اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے فیصلوں کے تیر ہیں۔ ان تیروں سے اگر بچاؤ کی کوئی جگہ ہے تو وہ اللہ تعالیٰ ہی کے دامن رحمت میں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی جگہ نہیں ہے ——— اس لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے کہ یا اللہ، ناقابل برداشت تکلیف مت دیجئے اور جب تکلیف دیں تو اس پر صبر بھی عطا فرمادیں اور اس کو میری مغفرت اور ترقی درجات کا ذریعہ بنائیے۔ آمین۔

ایک نادان بچے سے سبق لیں

آپ نے چھوٹے بچے کو دیکھا ہو گا کہ جب ماں اس کو مارتی ہے۔ اس وقت بھی وہ ماں ہی کی گود میں اور زیادہ گھستا ہے، حالانکہ جانتا ہے کہ میری ماں مجھے مار رہی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ بچہ یہ بھی جانتا ہے کہ ماں پٹائی تو کر رہی ہے لیکن اس پٹائی کا علاج بھی اسی کے پاس ہے اور مجھے شفقت اور محبت بھی اسی کی آغوش میں مل سکتی ہے ——— لہٰذا جب کبھی کوئی ناگوار بات یا واقعہ پیش آجائے تو یہ سوچو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور اسی کی آغوش رحمت میں مجھے پناہ مل سکتی ہے، یہ سوچ کر پھر اسی سے اس کے ازالے کی اور اس پر صبر کی دعا کریں۔ یہ ہے "رضا بالقضاء" اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عطا فرمادیں۔ آمین۔

اللہ کے فیصلے پر رضامندی خیر کی دلیل ہے

ایک اور حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿إذا اراد الله بعبدٍ خيرا ارضاهُ بما قسم له وبارک له فيه، واذا لم يرد به خيرا، لم يرضهِ بما قسم له ولم يبارک له فيه﴾

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی بھلائی اور خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو اپنی قسمت پر راضی کر دیتے ہیں، اور اس قسمت میں اس کے لئے برکت بھی عطا فرماتے ہیں، اور جب کسی سے بھلائی کا ارادہ نہ فرمائیں (العیاذ باللہ) تو اس کو اس کی قسمت پر راضی نہیں کرتے۔ یعنی اس کے دل میں قسمت پر اطمینان اور رضا پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس کے نتیجے میں یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ حاصل ہے۔ اس میں بھی برکت نہیں ہوتی ——— اس حدیث کے ذریعہ یہ بتادیا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو قسمت پر راضی کر دیتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ پھر یہ ہوتا ہے کہ اگرچہ اس کو تھوڑا ملا ہو، لیکن اس تھوڑے میں ہی اللہ تعالیٰ برکت عطا فرما دیتے ہیں۔

برکت کا مطلب اور مفہوم

آج کی دنیا گنتی کی دنیا ہے اور ہر چیز کی گنتی گنی جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ مجھے ایک ہزار روپے ملتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ مجھے دو ہزار روپے ملتے ہیں۔ تیسرا کہتا ہے کہ مجھے دس ہزار روپے ملتے ہیں ـــــ لیکن کوئی شخص یہ نہیں دیکھتا کہ اس گنتی کے نتیجے میں مجھے کتنی راحت ملی؟ کتنا آرام ملا؟ کتنی عافیت حاصل ہوئی؟ اب مثلاً ایک شخص کو پچاس ہزار روپے مل گئے۔ لیکن گھر کے اندر پریشانیاں، بیماریاں ہیں اور سکون حاصل نہیں ہے اور ہر وقت پریشانی کے اندر مبتلا ہے۔ اب بتایئے وہ پچاس ہزار کس کام کے؟ اس سے پتہ چلا کہ وہ پچاس ہزار روپے برکت والے نہیں تھے۔ بے برکتی والے ہیں ـــــ ایک دوسرا شخص ہے جس کو ایک ہزار روپے ملے۔ لیکن اس کو راحت اور آرام اور عافیت میسر ہے۔ تو اگرچہ وہ گنتی میں ایک ہزار ہیں۔ لیکن اپنے حاصل اور نتائج کے اعتبار سے یہ ایک ہزار والا پچاس ہزار والے سے آگے بڑھ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہزار برکت والے تھے اور اس ایک ہزار سے بے شمار کام اور فائدے حاصل ہو گئے۔

ایک نواب کا واقعہ

حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ نے مواعظ میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں ایک نواب تھے۔ ان کی بڑی زمینیں، جائیدادیں، نوکر چاکر وغیرہ سب کچھ تھا۔ ایک مرتبہ میری ان سے ملاقات ہوئی تو ان نواب صاحب نے خود مجھے بتایا کہ "میں اپنے بارے میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میرے پاس یہ ساری دولتیں ہیں۔ جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ لیکن مجھے ایک ایسی بیماری لاحق ہو گئی ہے کہ اس کی وجہ سے کوئی چیز نہیں کھا سکتا۔ اور میرے معالج نے میرے لئے صرف ایک غذا تجویز کی ہے۔ وہ یہ کہ گوشت کا قیمہ بناؤ، اور اس قیمہ کو ایک کپڑے میں باندھ کر اس کا رس نکالو اور اس

کو چمچے کے ذریعہ پیو ــــــ اب دیکھئے، دستر خوان پر دنیا بھر کے انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے ہیں، ہزار قسم کی نعمتیں حاصل ہیں لیکن صاحب بہادر نہیں کھا سکتے۔ اس لئے کہ بیمار ہیں۔ ڈاکٹر نے منع کردیا ہے۔ بتاؤ، وہ دولت کس کام کی جس کو انسان اپنی مرضی سے استعمال نہ کرسکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نعمت میں برکت نہیں ڈالی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نعمت بیکار ہو گئی ــــــ ایک دوسرا آدمی ہے جو محنت مزدوری کرتا ہے، ساگ روٹی کھاتا ہے، لیکن بھرپور بھوک کے ساتھ اور پوری لذّت کے ساتھ کھاتا ہے، اور وہ کھانا اس کے جسم کو جاکر لگتا ہے۔ اب بتایئے یہ مزدور بہتر ہے یا وہ نواب بہتر ہے؟ حالانکہ گنتی اس کی زیادہ ہے، اور اس مزدور کی گنتی کم ہے۔ لیکن راحت اس مزدور کو نصیب ہے۔ اس نواب کو میسّر نہیں۔ اس کا نام ہے برکت۔

قسمت پر راضی رہو

بہرحال، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا جو بندہ قسمت پر راضی ہوجائے اور قسمت پر راضی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تدبیر چھوڑ دے، اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے، بلکہ کام کرتا رہے۔ لیکن ساتھ میں اس پر راضی ہو کہ اس کام کرنے کے نتیجے میں جو کچھ مجھے مل رہا ہے۔ وہ میرے لئے بہتر ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے لئے اسی میں برکت عطا فرمادیتے ہیں۔ اسی کو راحت کا سبب بنادیتے ہیں ــــــ اور اگر کوئی شخص قسمت پر راضی نہ ہو، بلکہ ہر وقت ناشکری کرتا رہے اور یہ کہتا رہے کہ مجھے تو ملا ہی کیا ہے۔ میں تو محروم رہ گیا۔ میں تو پیچھے رہ گیا۔ تو اس کا نتیجہ پھر یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ تھوڑا بہت ملا ہوا ہے۔ اس کی لذت سے بھی محروم ہوجاتا ہے اور اس میں برکت نہیں ہوتی ــــــ انجام تو وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ چاہیں گے۔ اور اتنا ہی ملے گا جتنا اللہ تعالیٰ چاہیں گے، تمہارے رونے سے۔ ناشکری کرنے سے تمہاری حالت نہیں بدل جائے گی۔ لیکن اس ناشکری سے نقصان یہ ہوگا کہ موجودہ نعمت سے جو نفع حاصل ہوسکتا تھا وہ بھی

حاصل نہ ہوا۔

میرے پیمانے میں لیکن حاصل میخانہ ہے

اس لئے اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں پر راضی رہو، چاہے وہ مال و دولت کی نعمت ہو، پیشے کی نعمت ہو، صحت کی نعمت ہو۔ حسن و جمال کی نعمت ہو۔ دنیا کی ہر دولت اور ہر نعمت پر راضی رہو، اور یہ سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمت جس مقدار میں مجھے عطا فرمائی ہے وہ میرے حق میں بہتر ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا ؎

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مے
میرے پیمانے میں لیکن حاصل میخانہ ہے

یعنی دوسروں کے پیالوں میں کتنی مے بھری ہے، مجھے اس سے کیا تعلق، لیکن میرے پیمانے میں جو مے ہے، وہ میرے لئے کافی ہے۔ لہٰذا مجھے اس سے کیا غرض کہ کسی کو ہزار مل گئے۔ کسی کو لاکھ ملے، کوئی کروڑ پتی بن گیا، لیکن جو کچھ مجھے ملا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ میں اسی میں مگن ہوں، اور اس پر خوش ہوں ـــــــ بس یہ فکر حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی فکر سے قناعت حاصل ہوتی ہے۔ اسی سے رضا بالقضاء حاصل ہوتی ہے۔ اسی سے تکلیفیں اور صدمے دور ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ فکر عطا فرمادے اور اس کو ہمارا حال بنادے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

فتنہ کے دور کی نشانیاں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸ ۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب : ۱۴ر جولائی ۱۹۹۵ء

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پُرفتن دور کی نشانیاں
اور
مُسلمانوں کے لئے طرزِ عمل

الحمدلله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيات اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادی له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريک له ونشهدان سيدنا وسندنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى اله واصحابه وبارک وسلم تسليما كثيرا كثيرا۔

اما بعد

فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم۔ بسم الله الرحمن الرحيم

يٰايها الذين آمنوا عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم۔ الى الله مرجعكم جميعا فينبئكم بما كنتم تعملون

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اذا رايت شحا مطاعا وهوى متبعا ودينا موثرة واعجاب كل ذی رای

برایه۔ فعلیک یعنی نفسک ودع عنک العوام۔

(ابوداؤد۔ کتاب الملاحم، باب الأمر والنہی)

آمنت بالله صدق الله مولانا العظيم، وصدق رسوله النبی الكريم، ونحن على ذلك من الشاهدين والشاكرين، والحمدلله رب العالمين۔

حضور ﷺ تمام قوموں کیلئے قیامت تک کیلئے نبی ہیں

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے سلسلہ میں آج ایک ایسے موضوع پر مختصراً عرض کرنا چاہتا ہوں جس کی آج ضرورت بھی ہے۔ اور آپ کے ارشادات اور تعلیمات کا یہ پہلو بہت کم بیان کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں خاتم النبیین بنا کر مبعوث فرمایا۔ آپ پر نبوت کے سلسلے کی تکمیل ہوگئی۔ اور آپ کو دوسرے انبیاء پر یہ امتیاز عطا فرمایا کہ پہلے جو انبیاء تشریف لاتے تھے، وہ عموماً کسی خاص قوم کے لئے اور خاص جگہ کے لئے اور خاص زمانے کے لئے ہوتے تھے۔ ان کی تعلیمات اور دعوت ایک خاص علاقے تک محدود ہوتی تھی۔ اور ایک خاص زمانے تک محدود ہوتی تھی۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر کے علاقے میں بنی اسرائیل کی طرف مبعوث فرمائے گئے، اسی قوم اور اسی علاقے تک آپ کی نبوت اور رسالت محدود تھی۔ لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے کسی خاص قوم، کسی خاص قبیلے اور کسی خاص جگہ کے لئے نبی نہیں بنایا تھا، بلکہ پوری دنیا، پوری انسانیت اور قیامِ قیامت تک تمام زمانوں کے لئے نبی بنایا تھا۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وماارسلنٰک الا کافه للناس بشیراونذیرا﴾ (سورة سبا:۲۸)

یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ تمام انسانوں سے مراد یہ ہے کہ وہ جہاں

بھی بسنے والے ہوں اور جس زمانے میں بھی آنے والے ہوں، ان سب کی طرف آپ کو بھیجا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی رسالت صرف عرب تک مخصوص نہیں۔ اور صرف کسی ایک زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ قیامِ قیامت تک جتنے آنے والے زمانے ہیں، ان سب کے لئے آپ کو رسول بنایا۔

آئندہ پیش آنے والے حالات کی اطلاع

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آپ کی تعلیمات اور آپ کے بتائے ہوئے احکام قیامت تک نافذ العمل ہیں۔ کسی زمانے کے ساتھ آپ کی تعلیمات مخصوص نہیں۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جو تعلیمات عطا فرمائیں وہ زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہیں۔ اور پھر ان تعلیمات کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو میں تو شریعت کا بیان ہے کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں حرام ہے، یہ کام جائز ہے، اور یہ کام ناجائز ہے۔ فلاں عمل واجب ہے۔ فلاں عمل مسنون ہے۔ فلاں عمل مستحب ہے۔ وغیرہ۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ امت کو آئندہ آنے والے زمانوں میں کیا کیا حالات آنے والے ہیں۔ اور امت کو کن کن مسائل سے دو چار ہونا ہے اور اِن حالات میں امت کو کیا کرنا چاہئے؟

یہ دوسرا پہلو بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا بہت اہم حصہ ہے۔ چنانچہ آپ نے نگاہ نبوت سے آئندہ پیش آنے والے اہم واقعات کو دیکھنے کے بعد امت کو خبر دی کہ آئندہ زمانے میں یہ واقعہ پیش آنے والا ہے اور یہ حالات پیش آنے والے ہیں۔ اور ساتھ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ بھی بتایا کہ جب ایسے حالات پیش آئیں تو ایک مؤمن کو اور سیدھے راستے پر چلنے والے کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے؟ اور کیا طرز اختیار کرنا چاہئے؟ آج اس دوسرے پہلو پر تھوڑی سے گزارشات عرض کرنا چاہتا ہوں۔

امت کی نجات کی فکر

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کی ایسی فکر تھی کہ اس فکر کے اندر آپ ہروقت پریشان رہتے تھے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ:

﴿كان رسول الله صلى الله عليه وسلم دائم الفكرة متواصل الاحزان﴾

یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فکر مند، سوچ میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہروقت آپ پر کوئی غم چھایا ہوا ہے۔ کیا وہ غم پیسے جمع کرنے کا تھا؟ یا وہ غم اپنی شان و شوکت بڑھانے کا تھا؟ بلکہ وہ غم اس بات کا تھا کہ جس قوم کی طرف مجھے بھیجا گیا ہے، میں اس کو کس طرح جہنم کی آگ سے بچاؤں۔ اور کس طرح ان کو گمراہی سے نکال کر سیدھے راستے پر لے آؤں۔ اور اس شدید غم میں مبتلا ہونے کی وجہ سے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے بار بار آیات نازل فرمائیں۔ جس میں آپ کو اس غم کرنے سے روکا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿لعلک باخع نفسک الّا یکونوا مومنین﴾

یعنی آپ اپنی جان کو کیوں ہلاک کررہے ہیں، اس وجہ سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لارہے ہیں۔ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری مثال اس شخص جیسی ہے جس نے ایک آگ سلگائی اور آگ کو دیکھ کر پروانے آگ پر گرنے لگے۔ وہ شخص ان پروانوں کو آگ سے دور رکھنے کی کوشش کررہا ہے تاکہ وہ آگ میں گر کر جل نہ جائیں۔ اسی طرح میں بھی تمہیں جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کررہا ہوں، تمہاری کمریں پکڑ پکڑ کر تمہیں روک رہا ہوں۔ مگر تم جہنم کی آگ کے اندر گرے جارہے ہو۔ آپ کو اپنی امت کی اتنی فکر تھی۔ اور صرف اس امت کی فکر نہیں تھی جو آپ کے زمانے میں موجود تھی، بلکہ آئندہ آنے والے زمانے کے لوگوں کی بھی آپ کو فکر تھی۔

آئندہ کیا کیا فتنے آنے والے ہیں

چنانچہ آپ نے آئندہ آنے والے لوگوں کو بتایا کہ تمہارے زمانے میں کیا کیا حالات پیش آنے والے ہیں؟ چنانچہ تقریباً تمام احادیث کی کتابوں میں ایک مستقل باب "ابواب الفتن" کے نام سے موجود ہے، جس میں اِن احادیث کو جمع کیا گیا ہے جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے فتنوں کے بارے میں لوگوں کو بتایا اور اِن کو خبردار کیا کہ دیکھو! آئندہ زمانے میں یہ یہ فتنے آنے والے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿تقع الفتن فی بیوتکم کوقع المطر﴾

یعنی آئندہ زمانے میں فتنے تمہارے گھروں میں اس طرح گریں گے جیسے بارش کے قطرے گرتے ہیں۔ بارش کے قطروں سے اس لئے تشبیہ دی کہ جس طرح بارش کا پانی کثرت سے گرتا ہے۔ اسی طرح وہ فتنے بھی کثرت سے آئیں گے۔ اور دوسرے یہ کہ بارش کا پانی جس طرح مسلسل گرتا ہے کہ ایک قطرے کے بعد دوسرا قطرہ، دوسرے کے بعد فوراً تیسرا قطرہ۔ اسی طرح وہ فتنے بھی مسلسل اور لگاتار آئیں گے کہ ابھی ایک فتنہ آکر ختم نہیں ہوگا کہ دوسرا فتنہ کھڑا ہو جائے گا۔ دوسرے کے بعد تیسرا آئے گا۔ اور یہ فتنے تمہارے گھروں میں آکر گریں گے۔

ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿ستکون فتن کقطع اللیل المظلم﴾

عنقریب اندھیری رات کی تاریکیوں کی طرح تاریک فتنے ہونگے۔ یعنی جس طرح تاریک رات میں انسان کو کچھ نظر نہیں آتا کہ کہاں جائے، راستہ کہاں ہے؟ اسی طرح ان فتنوں کے زمانے میں بھی یہ سمجھ میں نہیں آئے گا کہ انسان کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ اور وہ فتنے تمہارے پورے معاشرے اور ماحول کو گھیر لیں گے، اور بظاہر تمہیں ان سے کوئی جائے پناہ نظر نہیں آئے گی۔ اور آپ نے فرمایا کہ ان

فتنوں سے پناہ کی دعا بھی مانگا کرو اور یہ دعا کیا کرو:

﴿اللھم ان نعوذ بک من الفتن ما ظھر منھا وما بطن﴾

اے اللہ! ہم آنے والے فتنوں سے آپ کی پناہ چاہتے ہیں۔ ظاہری فتنوں سے بھی اور باطنی فتنوں سے بھی پناہ چاہتے ہیں۔ دونوں قسم کے فتنوں سے پناہ مانگا کرو۔ اور یہ دعا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات کی دعاؤں میں شامل تھی۔

فتنہ کیا ہے؟

اب اس کو سمجھنا چاہئے کہ "فتنہ" کیا چیز ہے؟ کس کو "فتنہ" کہتے ہیں؟ اور اس "فتنہ" کے دور میں ہمارے اور آپ کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کیا ہے؟ اور اس میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ اب یہ لفظ تو ہم صبح و شام استعمال کرتے ہیں کہ یہ بڑے فتنے کا دور ہے۔ قرآنِ کریم میں بھی "فتنہ" کا لفظ کئی بار آیا ہے، ایک جگہ فرمایا: والفتنة اشدّ من القتل یعنی اللہ کے نزدیک فتنہ قتل سے بھی زیادہ شدید چیز ہے۔

"فتنہ" کے معنی اور مفہوم

"فتنہ" عربی زبان کا لفظ ہے، لغت میں اس کے معنی ہیں "سونے یا چاندی وغیرہ کو آگ پر پگھلا کر اس کا کھرا کھوٹا معلوم کرنا" آگ میں تپا کر اس کی حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہ خالص ہے یا نہیں؟ اسی وجہ سے اس لفظ کو آزمائش اور امتحان کے معنی میں بھی استعمال کیا جانے لگا، چنانچہ "فتنہ" کے دوسرے معنی ہوئے آزمائش، لہٰذا جب انسان پر کوئی تکلیف یا مصیبت یا پریشانی آئے اور اس کے نتیجے میں انسان کی اندرونی کیفیت کی آزمائش ہوجائے کہ وہ انسان ایسی حالت میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے؟ آیا اس وقت صبر کرتا ہے یا واویلا کرتا ہے۔ فرمانبردار رہتا ہے یا نافرمان ہوجاتا ہے۔ اِس آزمائش کو بھی "فتنہ" کہا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں "فتنہ" کا لفظ

حدیث شریف میں "فتنہ" کا لفظ جس چیز کے لئے استعمال ہوا ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی وقت کوئی ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے جس میں حق مشتبہ ہو جائے اور حق و باطل میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے، صحیح اور غلط میں امتیاز باقی نہ رہے۔ یہ پتہ نہ چلے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟ جب یہ صورتِ حال پیدا ہو جائے تو یہ کہا جائے گا کہ یہ فتنے کا دور ہے۔ اسی طرح معاشرے کے اندر گناہ، فسق و فجور، نافرمانیاں عام ہو جائیں تو اس کو بھی "فتنہ" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جو چیز حق نہ ہو اس کو حق سمجھنا، اور جو چیز دلیل ثبوت نہ ہو اس کو دلیل ثبوت سمجھ لینا بھی ایک "فتنہ" ہے۔ جیسے آج کل صورتِ حال ہے کہ اگر کسی سے دین کی بات کہو کہ فلاں کام گناہ ہے۔ ناجائز ہے۔ بدعت ہے۔ جواب میں وہ شخص کہتا ہے کہ ارے! یہ کام تو سب کر رہے ہیں، اگر یہ کام گناہ اور ناجائز ہے تو پھر ساری دنیا یہ کام کیوں کر رہی ہے۔ یہ کام تو سعودی عرب میں بھی ہو رہا ہے۔ آج کے دور میں یہ ایک نئی مستقل دلیل ایجاد ہو چکی ہے کہ ہم نے یہ کام سعودی عرب میں ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام سعودی عرب میں ہوتا ہو وہ یقینی طور پر حق اور درست ہے۔ یہ بھی ایک "فتنہ" ہے کہ جو چیز حق کی دلیل نہیں تھی اس کو دلیل سمجھ لیا گیا ہے۔ اسی طرح شہر کے اندر بہت ساری جماعتیں کھڑی ہو گئیں۔ اور یہ پتہ نہیں چل رہا ہے کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے۔ کون صحیح کہہ رہا ہے اور کون غلط کہہ رہا ہے۔ اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہو گیا، یہ بھی "فتنہ" ہے۔

دو جماعتوں کی لڑائی "فتنہ" ہے

اسی طرح جب دو مسلمان یا مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں، اور ایک

دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار آجائیں، اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوجائیں، اور یہ پتہ چلانا مشکل ہوجائے کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون ہے۔ تو یہ بھی ایک "فتنہ" ہے۔ ایک حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿اذا التقا المسلمان بسیفیهما فالقاتل والمقتول کلا هما فی النار﴾

جب دو مسلمان تلواریں لے کر آپس میں لڑنے لگیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے، ایک صحابیؓ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! قاتل کا جہنم میں جانا تو ٹھیک ہے۔ اس لئے کہ اس نے ایک مسلمان کو قتل کردیا۔ لیکن مقتول جہنم میں کیوں جائے گا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ مقتول اس لئے جہنم میں جائے گا کہ وہ بھی اسی ارادے سے ہتھیار لے کر نکلا تھا کہ میں دوسرے کو قتل کردوں۔ اِس کا داؤ چل جاتا تو یہ قتل کردیتا۔ لیکن اُس کا داؤ چل گیا اِس لئے اُس نے قتل کردیا۔ ان میں سے کوئی بھی اللہ کے لئے نہیں لڑ رہا تھا۔ بلکہ دنیا کے لئے، دولت کے لئے، اور سیاسی مقاصد کے لئے لڑ رہے تھے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ لہٰذا دونوں جہنم میں جائیں گے۔

قتل و غارت گری "فتنہ" ہے

ایک اور حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿ان من ورائکم ایاما یرفع فیها العلم ویکثر فیها الحرج، قالو یا رسول الله! ما الحرج؟ قال: القتل﴾ (ترمذی)

یعنی لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں "حرج" بہت زیادہ ہوجائے گا۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ یہ حرج کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ قتل و غارت گری، یعنی اس زمانے میں قتل و غارت گری بے حد ہوجائے گی اور انسان کی جان مچھر مکھی

سے زیادہ بے حقیقت ہوجائے گی۔ ایک اور حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿یاتی علی الناس یوم لا یدری القاتل فیم قتل، ولا المقتول فیم قتل، فقیل: کیف یکون ذلک؟ قال: الھرج، القاتل والمقتول فی النار﴾ (صحیح مسلم)

یعنی لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ جس میں قاتل کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ میں نے کیوں قتل کیا۔ اور مقتول کو یہ پتہ نہیں ہوگا کہ میں کیوں قتل کیا گیا؟ آج کے زمانے کے موجودہ حالات پر نظر ڈال لو، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کو پڑھ لو۔ ایسا لگتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے کو دیکھ کر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔ پہلے زمانے میں تو یہ ہوتا تھا کہ یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کس نے مارا، لیکن یہ معلوم ہوجاتا تھا کہ یہ شخص کیوں مارا گیا، مثلاً مال چھیننے کی وجہ سے مارا گیا، ڈاکوؤں نے مار دیا، دشمنی کی وجہ سے مار دیا گیا، مارے جانے کے اسباب سامنے آجاتے تھے۔ لیکن آج یہ حال ہے کہ ایک شخص ہے، کسی سے نہ کچھ لینا نہ دینا۔ نہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق۔ نہ کسی سے کوئی جھگڑا، بس بیٹھے بٹھائے مارا گیا۔ یہ ساری باتیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صاف صاف بتا گئے۔

مکہ مکرمہ کے بارے میں حدیث

ایک حدیث جو حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ کے بارے میں فرمایا:

﴿اذا دعیت کظائم۔ و ساوی ابنیتھا رؤس الجبال۔ فعند ذلک ازف الامر﴾

آج سے چند سال پہلے تک اس حدیث کا صحیح مطلب لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ لیکن اب سمجھ میں آگیا۔ حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب

مکہ مکرّمہ کا پیٹ چاک کردیا جائے گا۔اور اس میں نہروں جیسے راستے نکال دیئے جائیں گے۔ اور مکّہ مکرّمہ کی عمارتیں اس کے پہاڑوں سے زیادہ بُلند ہوجائیں گی، جب یہ چیزیں نظر آئیں گی تو سمجھ لو کہ فتنے کا وقت قریب آگیا۔

مکّہ مکرّمہ کا پیٹ چاک ہونا

یہ حدیث چودہ سو سال سے حدیث کی کتابوں میں لکھی چلی آرہی ہے، اور اس حدیث کی تشریح کرتے وقت شرّاحِ حدیث حیران تھے کہ مکّہ مکرّمہ کا پیٹ کس طرح چاک ہوگا؟ اور نہروں جیسے راستے بننے کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ اس کا تصوّر کرنا مشکل تھا۔ لیکن آج کے مکّہ مکرّمہ کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے آج کے مکّہ مکرّمہ کو دیکھ کر یہ باتیں ارشاد فرمائی تھیں۔ آج مکّہ مکرّمہ کو چاک کرکے اس میں بے شمار سرنگیں نکال دی گئی ہیں۔ آج سے پہلے شرّاحِ حدیث فرماتے تھے کہ اس وقت تو یہ مکّہ مکرّمہ کا علاقہ خشک اور سنگلاخ پہاڑی علاقہ ہے، لیکن آئندہ کسی زمانے میں اللہ تعالیٰ اس میں نہریں اور ندیاں جاری کردیں گے۔ لیکن آج ان سرنگوں کو دیکھ کر یہ نظر آرہا ہے کہ کس طرح مکّہ مکرّمہ کا پیٹ چاک کردیا گیا۔

عمارتوں کا پہاڑوں سے بُلند ہونا

دوسرا جملہ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ جب اس کی عمارتیں پہاڑوں سے بھی بُلند ہوجائیں گی۔ آج سے چند سال پہلے تک کسی کے تصوّر میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ مکّہ مکرّمہ میں پہاڑوں سے بھی زیادہ بُلند عمارتیں بن جائیں گی۔ کیونکہ سارا مکّہ پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ لیکن آج مکّہ مکرّمہ میں جاکر دیکھ لیں کہ کس طرح پہاڑوں سے بُلند عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو

سال پہلے آج کے حالات گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بیان فرمادیئے تھے، اللہ تعالیٰ کے عطا فرمودہ وحی اور علم کے ذریعہ یہ ساری باتیں روز روشن کی طرح آشکار کردی گئی تھیں، آپ نے ایک ایک چیز کھول کھول کر بیان فرمادی کہ آئندہ زمانے میں کیا ہونے والا ہے۔ اور آپ نے یہ بتایا کہ اس زمانے میں مسلمانوں کو کیا کیا مشکلات اور فتنے پیش آنے ولے ہیں۔ اور ساتھ میں یہ بھی بتادیا کہ اس وقت میں ایک مسلمان کو کیا راہِ عمل اختیار کرنا چاہئے؟

موجودہ دور حدیث کی روشنی میں

جن احادیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے آئندہ آنے والے فتنوں کی نشان دہی فرمائی ہے۔ ہر مسلمان کو وہ احادیث یاد رکھنی چاہئیں۔ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب مدظلہم نے ایک کتاب "عصر حاضر حدیث کے آئینے میں" کے نام سے تحریر فرمائی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے فتنوں سے متعلق تمام احادیث کو جمع کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اس میں ایک حدیث ایسی لائے ہیں جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ کے دور کی ۷۲ باتیں بیان فرمائی ہیں۔ ان کو آپ سنتے جائیں اور اپنے گردو پیش کا جائزہ لیتے جائیں کہ یہ سب باتیں ہمارے موجودہ ماحول پر کس طرح صادق آرہی ہیں:

فتنہ کی ۷۲ نشانیاں

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے قریب ۷۲ باتیں پیش آئیں گی۔

(۱) لوگ نمازیں غارت کرنے لگیں گے۔ یعنی نمازوں کا اہتمام رخصت ہوجائے گا۔ یہ بات اگر اس زمانے میں کہی جائے تو کوئی زیادہ تعجب کی بات نہیں سمجھی جائے گی۔ اس لئے کہ آج مسلمانوں کی اکثریت ایسی ہے جو نماز کی پابند نہیں ہے۔ العیاذ باللہ۔

لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اس وقت ارشاد فرمائی تھی جب نماز کو کفر اور ایمان کے درمیان حدِ فاصل قرار دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں مؤمن کتنا ہی بُرے سے بُرا ہو۔ فاسق فاجر ہو۔ بدکار ہو، لیکن نماز نہیں چھوڑتا تھا۔ اس زمانے میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ لوگ نمازیں غارت کرنے لگیں گے۔

(۲) امانت ضائع کرنے لگیں گے۔ یعنی جو امانت ان کے پاس رکھی جائیں گی، اس میں خیانت کرنے لگیں گے۔

(۳) سُود کھانے لگیں گے۔

(۴) جھوٹ کو حلال سمجھنے لگیں گے۔ یعنی جھوٹ ایک فن اور ہنر بن جائے گا۔

(۵) معمولی معمولی باتوں پر خونریزی کرنے لگیں گے۔ ذرا سی بات پر دوسرے کی جان لے لیں گے۔

(۶) اونچی اونچی بلڈنگیں بنائیں گے۔

(۷) دین بیچ کر دنیا جمع کریں گے۔

(۸) قطع رحمی، یعنی رشتہ داروں سے بدسلوکی ہوگی۔

(۹) انصاف نایاب ہوجائے گا۔

(۱۰) جھوٹ سچ بن جائے گا۔

(۱۱) لباس ریشم کا پہنا جائے گا۔

(۱۲) ظلم عام ہوجائے گا۔

(۱۳) طلاقوں کی کثرت ہوگی۔

(۱۴) ناگہانی موت عام ہوجائے گی۔ یعنی ایسی موت عام ہوجائے گی جس کا پہلے سے پتہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اچانک پتہ چلے گا کہ فلاں شخص ابھی زندہ ٹھیک ٹھاک تھا اور اب مرگیا۔

(۱۵) خیانت کرنے والے کو امین سمجھا جائے گا۔

(۱۶) امانت دار کو خائن سمجھا جائے گا۔ یعنی امانت دار پر تہمت لگائی جائے گی کہ یہ

خائن ہے۔

(۱۷) جھوٹے کو سچا سمجھا جائے گا۔

(۱۸) سچے کو جھوٹا کہا جائے گا۔

(۱۹) تہمت درازی عام ہو جائے گی۔ یعنی لوگ ایک دوسرے پر جھوٹی تہمتیں لگائیں گے۔

(۲۰) بارش کے باوجود گرمی ہوگی۔

(۲۱) لوگ اولاد کی خواہش کرنے کے بجائے اولاد سے کراہیت کریں گے۔ یعنی جس طرح لوگ اولاد ہونے کی دعائیں کرتے ہیں، اس کے بجائے لوگ یہ دعائیں کریں گے کہ اولاد نہ ہو۔ چنانچہ آج دیکھ لیں کہ خاندانی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ اور یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ بچے دو ہی اچھے۔

(۲۲) کمینوں کے ٹھاٹھ ہونگے۔ یعنی کمینے لوگ بڑے ٹھاٹھ سے عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گزاریں گے۔

(۲۳) شریفوں کا ناک میں دم آجائے گا۔ یعنی شریف لوگ شرافت کو لے کر بیٹھیں گے تو دنیا سے کٹ جائیں گے۔

(۲۴) امیر اور وزیر جھوٹ کے عادی بن جائیں گے۔ یعنی سربراہِ حکومت اور اس کے اعوان و انصار اور وزراء جھوٹ کے عادی بن جائیں گے، اور صبح شام جھوٹ بولیں گے۔

(۲۵) امین خیانت کرنے لگیں گے۔

(۲۶) سردار ظلم پیشہ ہونگے۔

(۲۷) عالم اور قاری بدکار ہونگے۔ یعنی عالم بھی ہیں اور قرآنِ کریم کی تلاوت بھی کر رہے ہیں، مگر بدکار ہیں۔ العیاذ باللہ

(۲۸) لوگ جانوروں کی کھالوں کا لباس پہنیں گے۔

(۲۹) مگر ان کے دل مردار سے زیادہ بدبو دار ہونگے۔ یعنی لوگ جانوروں کی کھالوں

سے بنے ہوئے اعلیٰ درجے کے لباس پہنیں گے۔ لیکن ان کے دل مردار سے زیادہ بدبو دار ہوں گے۔

(۳۰) اور ایلوے سے زیادہ کڑوے ہوں گے۔

(۳۱) سونا عام ہو جائے گا۔

(۳۲) چاندی کی مانگ ہوگی۔

(۳۳) گناہ زیادہ ہو جائیں گے۔

(۳۴) امن کم ہو جائے گا۔

(۳۵) قرآنِ کریم کے نسخوں کو آراستہ کیا جائے گا اور اس پر نقش و نگار بنایا جائے گا۔

(۳۶) مسجدوں میں نقش و نگار کئے جائیں گے۔

(۳۷) اونچے اونچے مینار بنیں گے۔

(۳۸) لیکن دل ویران ہوں گے۔

(۳۹) شرابیں پی جائیں گی۔

(۴۰) شرعی سزاؤں کو معطّل کردیا جائے گا۔

(۴۱) لونڈی اپنے آقا کو جنے گی۔ یعنی بیٹی ماں پر حکمرانی کرے گی۔ اور اس کے ساتھ ایسا سلوک کرے گی جیسے آقا اپنی کنیز کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔

(۴۲) جو لوگ ننگے پاؤں، ننگے بدن، غیر مہذب ہونگے وہ بادشاہ بن جائیں گے۔ کمینے اور نیچ ذات کے لوگ جو نسبی اور اخلاق کے اعتبار سے کمینے اور نیچے درجے کے سمجھے جاتے ہیں، وہ سربراہ بن کر حکومت کریں گے۔

(۴۳) تجارت میں عورت مرد کے ساتھ شرکت کرے گی۔ جیسے آج کل ہو رہا ہے کہ عورتیں زندگی کے ہر کام میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش کررہی ہیں۔

(۴۴) مرد عورتوں کی نقالی کریں گے۔

(۴۵) عورتیں مردوں کی نقالی کریں گی۔

یعنی مرد عورتوں جیسا حلیہ بنائیں گے اور عورتیں مردوں جیسا حلیہ بنائیں گی۔ آج دیکھ لیں کہ نئے فیشن نے یہ حالت کردی ہے کہ دور سے دیکھو تو پتہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ یہ مرد ہے یا عورت ہے۔

(۴۶) غیر اللہ کی قسمیں کھائی جائیں گی۔ یعنی قسم تو صرف اللہ کی یا اللہ کی صفت کی اور قرآن کی کھانا جائز ہے۔ دوسری چیزوں کی قسم کھانا حرام ہے۔ لیکن اس وقت لوگ اور چیزوں کی قسم کھائیں گے۔ مثلاً تیرے سر کی قسم وغیرہ۔

(۴۷) مسلمان بھی بغیر کہے جھوٹی گواہی دینے کو تیار ہوگا۔ لفظ "بھی" کے ذریعہ یہ بتادیا کہ اور لوگ تو یہ کام کرتے ہی ہیں، لیکن اس وقت مسلمان بھی جھوٹی گواہی دینے کو تیار ہوجائیں گے۔

(۴۸) صرف جان پہچان کے لوگوں کو سلام کیا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر راستے میں کہیں سے گزر رہے ہیں تو ان لوگوں کو سلام نہیں کیا جائے گا جن سے جان پہچان نہیں ہے، اگر جان پہچان ہے تو سلام کرلیں گے۔ حالانکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یہ ہے کہ السلام علی من عرفت ومن لم تعرف جس کو تم جانتے ہو، اس کو بھی سلام کرو۔ اور جس کو تم نہیں جانتے، اس کو بھی سلام کرو۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ راستے میں اِکا دُکا آدمی گزر رہے ہوں تو اس وقت سب آنے جانے والوں کو سلام کرنا چاہئے۔ لیکن اگر آنے جانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو، اور سلام کی وجہ سے اپنے کام میں خلل آنے کا اندیشہ ہو تو پھر سلام نہ کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ لیکن ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اِکا دُکا آدمی گزر رہے ہوں گے تب بھی سلام نہیں کریں گے اور سلام کا رواج ختم ہوجائے گا۔

(۴۹) غیر دین کے لئے شرعی علم پڑھا جائے گا۔ یعنی شرعی علم دین کے لئے نہیں، بلکہ دنیا کے لئے پڑھا جائے گا۔ العیاذ باللہ۔ اور مقصد یہ ہوگا کہ اس کے ذریعہ ہمیں ڈگری مل جائے گی، ملازمت مل جائے گی، پیسے مل جائیں گے، عزت اور شہرت حاصل ہوجائے گی۔ ان مقاصد کے لئے دین کا علم پڑھا جائے گا۔

(۵۰) آخرت کے کام سے دنیا کمائی جائے گی۔

(۵۱) مالِ غنیمت کو ذاتی جاگیر سمجھ لیا جائے گا۔ مالِ غنیمت سے مراد قومی خزانہ ہے۔ یعنی قومی خزانہ کو ذاتی جاگیراور ذاتی دولت سمجھ کر معاملہ کریں گے۔

(۵۲) امانت کو لوٹ کر مال سمجھا جائے گا۔ یعنی اگر کسی نے امانت رکھوادی تو سمجھیں گے کہ یہ لوٹ کا مال حاصل ہوگیا۔

(۵۳) زکوٰۃ کو جُرمانہ سمجھا جائے گا۔

(۵۴) سب سے رذیل آدمی قوم کا لیڈر اور قائد بن جائے گا۔ یعنی قوم میں جو شخص سب سے زیادہ رذیل اور بد خصلت انسان ہوگا، اس کو قوم کے لوگ اپنا قائد، اپنا ہیرو اور اپنا سربراہ بنالیں گے۔

(۵۵) آدمی اپنے باپ کی نافرمانی کرے گا۔

(۵۶) آدمی اپنی ماں سے بد سلوکی کرے گا۔

(۵۷) دوست کو نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرے گا۔

(۵۸) بیوی کی اطاعت کرے گا۔

(۵۹) بدکاروں کی آوازیں مسجدوں میں بُلند ہوں گی۔

(۶۰) گانے والی عورتوں کی تعظیم و تکریم کی جائے گی۔ یعنی جو عورتیں گانے بجانے کا پیشہ کرنے والی ہیں، اِن کی تعظیم اور تکریم کی جائے گی اور اِن کو بُلند مرتبہ دیا جائے گا۔

(۶۱) گانے بجانے کے اور موسیقی کے آلات کو سنبھال کر رکھا جائے گا۔

(۶۲) سرراہ شرابیں پی جائیں گی۔

(۶۳) ظلم کو فخر سمجھا جائے گا۔

(۶۴) انصاف بکنے لگے گا۔ یعنی عدالتوں میں انصاف فروخت ہوگا۔ لوگ پیسے دے کر اِس کو خریدیں گے۔

(۶۵) پولیس والوں کی کثرت ہو جائے گی۔

(۶۶) قرآنِ کریم کو نغمہ سرائی کا ذریعہ بنالیا جائے گا۔ یعنی موسیقی کے بدلے میں قرآن کی تلاوت کی جائے گی، تاکہ اس کے ذریعہ ترنّم کا حظ اور مزہ حاصل ہو۔ اور قرآن کی دعوت اور اس کو سمجھنے یا اس کے ذریعہ اجر و ثواب حاصل کرنے کے لئے تلاوت نہیں کی جائے گی۔

(۶۷) درندوں کی کھال استعمال کی جائے گی۔

(۶۸) امّت کے آخری لوگ اپنے سے پہلے لوگوں پر لعن طعن کریں گے۔ یعنی ان پر تنقید کریں گے اور ان پر اعتماد نہیں کریں گے، اور تنقید کرتے ہوئے یہ کہیں گے کہ انہوں نے یہ بات غلط کہی۔ اور یہ غلط طریقہ اختیار کیا۔ چنانچہ آج بہت بڑی مخلوق صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی شان میں گستاخیاں کررہی ہے، بہت سے لوگ ان ائمہ دین کی شان میں گستاخیاں کررہے ہیں جن کے ذریعہ یہ دین ہم تک پہنچا، اور اِن کو بے وقوف بتا رہے ہیں کہ وہ لوگ قرآن و حدیث کو نہیں سمجھے، دین کو نہیں سمجھے۔ آج ہم نے دین کو صحیح سمجھا ہے۔

پھر فرمایا کہ جب یہ علامات ظاہر ہوں تو اس وقت اس کا انتظار کرو کہ

(۶۹) یا تو تم پر سرخ آندھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آجائے۔

(۷۰) یا زلزلے آجائیں۔

(۷۱) یا لوگوں کی صورتیں بدل جائیں۔

(۷۲) یا آسمان سے پتھر برسیں۔ یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اور عذاب آجائے۔ العیاذ باللہ۔ اب آپ ان علامات میں ذرا غور کرکے دیکھیں کہ یہ سب علامات ایک ایک کرکے کس طرح ہمارے معاشرے پر صادق آرہی ہیں۔ اور اِس وقت جو عذاب ہم پر مسلّط ہے وہ درحقیقت انہی بد اعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ (دُر منثور صفحہ ۵۲ جلد ۶)

مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا

ایک اور حدیث میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب میری امت میں پندرہ کام عام ہو جائیں گے تو اِن پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ صحابہ کرامؓ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ پندرہ کام کون سے ہیں؟ جواب میں آپ نے فرمایا:

قومی خزانے کے چور کون کون

(۱) جب سرکاری خزانے کو لوٹ کا مال سمجھا جانے لگے۔ دیکھ لیجئے کہ آج کس طرح قومی خزانے کو لوٹا جارہا ہے، اور پھر یہ صرف حکمرانوں کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ جب حکمران لوٹتے ہیں تو عوام میں سے جس کا بھی داؤ چل جائے وہ بھی لوٹتا ہے۔ چنانچہ بہت سے کام ایسے ہیں جس میں ہم اور آپ اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس کام کی وجہ سے ہماری طرف سے قومی خزانے پر لوٹ ہو رہی ہے۔ مثلاً بجلی کی چوری ہے کہ کہیں سے خلاف قانون کنکشن لے لیا اور اس کو استعمال کرنا شروع کردیا، یہ قومی خزانے کی چوری ہے۔ یا مثلاً ٹیلیفون ایکسچنج والے سے دوستی کرلی، اور اب اس کے ذریعہ لمبی لمبی کالیں مفت کی جارہی ہیں۔ یہ بھی قومی خزانے کی چوری ہے۔ یا مثلاً ریل کے ذریعہ بلا ٹکٹ سفر کرلیا۔ یہ بھی قومی خزانے کی چوری ہے۔ یا مثلاً ریل میں اونچے درجے میں سفر کرلیا، جبکہ ٹکٹ نیچے درجہ کا خریدا ہے۔ یہ بھی قومی خزانے کی چوری ہے۔

یہ خطرناک چوری ہے

اور یہ قومی خزانے کی چوری عام چوری سے بہت زیادہ خطرناک ہے۔ اس لئے کہ اگر انسان کسی کے گھر پر چوری کرلے اور بعد میں اس کی تلافی کرنا چاہے تو اس کی تلافی کرنا آسان ہے کہ جتنی رقم چوری کی ہے اتنی رقم اس کو لے جاکر واپس کردے، یا اس سے جاکر معاف کرالے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی تھی، مجھے معاف کردینا، اور اس نے معاف کردیا تو انشاء اللہ معاف ہوجائے گا۔ لیکن قومی خزانے

کے اندر لاکھوں انسانوں کا حصہ ہے۔ اور ہر انسان کی اس میں ملکیت ہے۔ اگر اس مال کو چوری کرلیا یا زیادتی کرلی تو اب کس کس انسان سے معاف کراؤ گے؟ اور جب تک ان لاکھوں حق داروں سے معاف نہیں کراؤ گے اس وقت تک معافی نہیں ہوگی۔ اس لئے عام مال کی چوری کی معافی آسان ہے۔ لیکن قومی خزانے کی چوری کے بعد اس کی معافی بہت مشکل ہے۔ العیاذ باللہ۔

(۲) جب امانت کو لوگ لوٹ کا مال سمجھنے لگیں، اور اس میں خیانت کرنے لگیں۔

(۳) اور جب لوگ زکوۃ کو تاوان اور جُرمانہ سمجھنے لگیں۔

(۴) آدمی بیوی کی اطاعت کرے۔ اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے۔ یعنی آدمی بیوی کی خوشنودی کی خاطر ماں کی نافرمانی کرے۔ مثلاً بیوی ایک ایسے غلط کام کو کرنے کے لئے کہہ رہی ہے جس میں ماں کی نافرمانی ہو رہی ہے تو وہ شخص ماں کی حُرمت کو نظر انداز کردیتا ہے اور بیوی کو راضی کرنے کے لئے وہ کام کرلیتا ہے۔

(۵) اور آدمی دوست کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا اور باپ کے ساتھ بُرا سلوک کرے گا، یعنی دوست کے ساتھ دوستی کا لحاظ کرے گا، لیکن باپ کے ساتھ سختی اور بدسلوکی کا معاملہ کرے گا۔

مساجد میں آوازوں کی بُلندی

(۶) مسجدوں میں آوازیں بُلند ہوں گی۔ مسجدیں تو اس لئے وضع کی گئی ہیں کہ اس میں اللہ کا ذکر کیا جائے، اور اللہ کی عبادت اور ذکر کرنے والوں کے ذکر اور عبادت میں کوئی خلل نہ ڈالا جائے۔ لیکن لوگ مسجدوں میں آوازیں بُلند کرکے خلل ڈالیں گے، چنانچہ آج کل الحمد للہ مسجدوں میں نکاح کرنے کا رواج تو ہوگیا ہے، جو اچھا رواج ہے، لیکن نکاح کے موقع پر مسجد کی حُرمت کا لحاظ نہیں کیا جاتا، اور اس وقت شور کیا جاتا ہے، آوازیں بُلند کی جاتی ہیں، جو ایک گناہِ بے لذت ہے۔ اس

لئے کہ بعض گناہ وہ ہوتے ہیں جس کے کرنے میں کچھ لذت اور مزہ بھی آتا ہے لیکن یہ گناہ ایسا ہے کہ جس کے کرنے میں کوئی لذت اور مزہ نہیں ہے بلکہ مسجد میں آواز بلند کر کے بلاوجہ اپنے سر گناہ لے لیا۔

(۷) قوم کا لیڈر ان کا ذلیل ترین آدمی ہو گا۔

(۸) آدمی کی عزت اس کے شر کے خوف سے کی جانے لگے کہ اگر اس کی عزت نہیں کروں گا تو یہ مجھے کسی نہ کسی مصیبت میں پھنسا دے گا۔

(۱۰) اور شرابیں پی جانے لگیں گی۔

(۱۱) ریشم پہنا جائے گا۔

گھروں میں گانے والی عورتیں

(۱۲) گانے بجانے والی عورتیں رکھی جائیں گی۔ اور موسیقی کے آلات سنبھال سنبھال کے رکھے جائیں گے۔ یہ اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں جب اِن باتوں کا تصور بھی نہیں تھا۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جو لفظ استعمال فرمایا وہ یہ کہ گانے بجانے والی عورتیں رکھنے لگیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہر شخص گانے بجانے والی عورتیں تو اپنے پاس کیسے رکھ سکتا ہے اس لئے کہ ہر شخص کے اندر اتنی استطاعت کہاں کہ وہ گانے بجانے والی عورت کو اپنے پاس رکھے۔ اور جب چاہے اس سے گانے سنے۔ لیکن ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، ٹی وی اور وی سی آر نے اس مسئلہ کو آسان کردیا۔ اب ہر شخص کے گھر میں ریڈیو اور ٹی وی موجود ہے۔ ویڈیو کیسٹ موجود ہے۔ جب چاہے گانا سنے اور گانے والی عورت کو دیکھ لے۔

اسی طرح گانے بجانے کے آلات ہر شخص اپنے پاس نہیں رکھتا، لیکن آج کے ریڈیو، ٹی وی اور وی سی آر نے یہ باجے گھر گھر پہنچادیئے، اور اب آلاتِ موسیقی خرید کر لانے کی ضرورت نہیں۔ بس ٹی وی آن کردو تو آلاتِ موسیقی کے تمام

مقاصد اس کے ذریعہ تمہیں حاصل ہو جائیں گے۔

(۱۳) اور اس امت کے آخری لوگ پہلے لوگوں پر لعنت کرنے لگیں۔ بہرحال، آپ نے فرمایا کہ جب یہ باتیں میری امت میں پیدا ہو جائیں گی تو ان پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ العیاذ باللہ۔ اس حدیث میں بھی جتنی باتیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں وہ سب باتیں آج ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔

شراب کو شربت کے نام سے پیا جائے گا

ایک اور حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب میری امت کے لوگ شراب کو شربت کہہ کر حلال کرنے لگیں۔ مثلاً شراب کو کہیں کہ یہ تو ایک شربت ہے، اس کے حرام ہونے کا کیا مطلب؟ چنانچہ آج لوگوں نے اس موضوع پر کتابیں اور مقالے لکھ دیئے کہ موجودہ شراب حرام نہیں ہے، اور قرآنِ کریم میں شراب کے لئے کہیں حرام کا لفظ نہیں آیا ہے، اس لئے شراب حرام نہیں۔ اور یہ جو بئر ہے یہ جو کا پانی ہے، اور جس طرح دوسرے شربت ہوتے ہیں یہ بھی ایک شربت ہے۔ اس طرح آج شراب کو حلال کرنے پر دلائل پیش کئے جارہے ہیں۔ یہ وہی بات ہے جس کی خبر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال پہلے دیدی تھی۔

سُود کو تجارت کا نام دیا جائے گا

اور جب میری امت کے لوگ سُود کو تجارت کہہ کر حلال کرنے لگیں کہ یہ سُود بھی ایک تجارت ہے۔ جیسے آج کل کہا جارہا ہے کہ یہ بینکوں میں جو سُود کا لین دین ہو رہا ہے، یہ تجارت کی ہی ایک شکل ہے، اگر اس کو بند کردیا تو ہماری تجارت ختم ہو جائے گی۔

رشوت کو ہدیہ کا نام دیا جائے گا

اور جب میری امت کے لوگ رشوت کو ہدیہ کہہ کر حلال کرنے لگیں۔ مثلاً رشوت دینے والا یہ کہے کہ یہ ہم نے آپ کو ہدیہ دیا ہے، اور رشوت لینے والا رشوت کو ہدیہ کہہ کر اپنے پاس رکھ لے۔ حالانکہ حقیقت میں وہ رشوت ہے۔ چنانچہ آج کل یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اور زکوٰۃ کے مال کو مالِ تجارت بنالیں تو اس وقت اس امت کی ہلاکت کا وقت آجائے گا۔ العیاذ باللہ۔ یہ چاروں باتیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائیں، وہ ہمارے موجودہ دور پر پوری طرح صادق آرہی ہیں۔ (کنز العمال حدیث نمبر ۳۸۴۹۷)

کشنوں پر سوار ہو کر مسجد میں آنا

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آخری دور میں (فتنے کے زمانے میں) لوگ میاسرِ پر سوار ہو کر آئیں گے اور مسجد کے دروازوں پر اتریں گے۔ "میاسرِ" عربی زبان میں بڑے عالیشان ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں جو اِس زمانے میں بہت شان و شوکت اور دبدبے والے لوگ اپنے گھوڑے کی زین پر ڈالا کرتے تھے اور بطور "کشن" کے استعمال کرتے تھے۔ گویا کہ آپ نے فرمایا کہ کشنوں پر سواری کرکے مسجد کے دروازوں پر اتریں گے۔ پہلے زمانے میں اس کا تصوّر مشکل تھا کہ لوگ کشنوں پر سواری کرکے کس طرح آکر مسجد کے دروازوں پر اتریں گے۔ لیکن اب کاریں ایجاد ہو گئیں تو دیکھیں کہ کس طرح لوگ کاروں میں سوار ہو کر آرہے ہیں اور مسجد کے دروازوں پر اتر رہے ہیں۔

عورتیں لباس پہننے کے باوجود ننگی

آگے فرمایا کہ "ان کی عورتیں لباس پہننے کے باوجود ننگی ہوں گی" پہلے زمانے میں

اس کا تصور بھی مشکل تھا کہ لباس پہننے کے باوجود کس طرح ننگی ہوں گی، لیکن آج آنکھوں سے نظر آرہا ہے کہ لباس پہننے کے باوجود عورتیں کس طرح ننگی ہیں۔ اس لئے کہ یا تو وہ لباس اتنا باریک ہے کہ جسم اس سے نظر آرہا ہے، یا وہ لباس اتنا مختصر اور چھوٹا ہے کہ لباس پہننے کے باوجود اعضاء پورے نہیں چھپے، یا وہ لباس اتنا چست ہے کہ اس کی وجہ سے سارے اعضاء نمایاں ہو رہے ہیں۔

(صحیح مسلم، کتاب اللباس، باب النساء الکاسیات)

عورتوں کے بال اونٹ کے کوہان کی طرح

آگے فرمایا کہ "ان عورتوں کے سروں پر اونٹوں کے کوہان جیسے بال ہوں گے" یہ حدیث بھی اِن احادیث میں سے ہے کہ پچھلے علماء اس کی شرح کے وقت حیران ہوتے تھے کہ اونٹوں کے کوہان جیسے بال کیسے ہوں گے۔ اس لئے کہ اونٹوں کا کوہان تو اٹھا ہوا اونچا ہوتا ہے، بال کس طرح اونچے ہو جائیں گے۔ لیکن آج اس دور نے ناقابل تصور چیز کو حقیقت بنا کر آنکھوں کے سامنے دکھا دیا۔ اور موجودہ دور کی عورتوں کی جو تشبیہ آپ ؐ نے بیان فرمائی، اس سے بہتر تشبیہ کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ عورتیں ملعون ہیں

آگے فرمایا کہ "ایسی عورتوں پر لعنت بھیجو، اس لئے کہ ایسی عورتیں ملعون ہیں"۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو ایک ایسی چیز بنایا ہے جو اپنے دائرے کے اندر محدود رہے۔ اور جب یہ عورت بے پردہ باہر نکلتی ہے تو حدیث شریف میں ہے کہ شیطان اس کی تانک جھانک میں لگ جاتا ہے۔ اور فرمایا کہ جب عورت خوشبو لگا کر بازاروں کے اندر جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر لعنت ہوتی ہے۔ اور فرشتے ایسی عورت پر لعنت بھیجتے ہیں۔

لباس کا مقصد اصلی

لباس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ستر عورت حاصل ہو جائے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ:

﴿یٰبَنِیۡۤ اٰدم قد انزلنا علیکم لباسا یواری سوٰاتکم وریشاً﴾

"یعنی ہم نے لباس اس لئے اتارا تاکہ وہ تمہارے ستر کو چھپائے اور زینت کا سامان ہو"۔

لہٰذا جو لباس ستر کو نہ چھپائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ لباس کا جو اصل مقصد تھا وہ فوت کر دیا گیا۔ اور جب اصل مقصد فوت ہو گیا تو لباس پہننے کے باوجود وہ لباس پہننے والا برہنہ ہے۔ خدا کے لئے اس کا اہتمام کریں کہ لباس ہمارا درست ہو۔ آج کل اچھے خاصے دیندار، نمازی، پرہیز گار لوگوں کے اندر بھی اس کا اہتمام ختم ہو گیا ہے۔ لباس میں اس کی پرواہ نہیں کہ اس میں پردہ پورا ہو رہا ہے یا نہیں؟ انہی چیزوں کا وبال آج ہم لوگ بھگت رہے ہیں۔ لہٰذا کم از کم اپنے گھرانوں میں اور اپنے خاندانوں میں اس کا اہتمام کر لیں کہ لباس شریعت کے مطابق ہو۔ اور اس میں پردہ کا لحاظ ہو، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی لعنت کی وعید سے محفوظ ہو۔

دوسری قومیں مسلمانوں کو کھائیں گی

ایک حدیث میں حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم پر ایک ایسا وقت آنے والا ہے کہ دنیا کی دوسری قومیں تمہیں کھانے کے لئے ایک دوسرے کو دعوت دیں گی۔ جیسے لوگ دستر خوان پر بیٹھ کر دوسروں کو کھانے کی دعوت دیتے ہیں۔ مثلاً دستر خوان بچھا ہوا ہے، اس پر کھانے چنے ہوئے ہیں۔ اس پر ایک آدمی بیٹھا ہے۔ اتنے میں دوسرا شخص

آگیا تو پہلا اس سے کہتا ہے کہ آؤ کھانا تناول فرماؤ اور کھانے میں شریک ہو جاؤ۔ اسی طرح ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس وقت مسلمانوں کا دستر خوان بچھا ہوگا، اور مسلمان کی حیثیت ایسی ہوگی جیسے دستر خوان پر کھانا ہوتا ہے۔ اور بڑی بڑی قومیں اور طاقتیں مسلمانوں کو کھا رہی ہونگی۔ اور دوسری قوموں کو دعوت دے رہی ہوں گی کہ آؤ اور مسلمانوں کو کھاؤ۔ (ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب فی تداعی الامم علی الاسلام)

جن حضرات کو پچھلے سو سال کی تاریخ کا علم ہے یعنی پہلی جنگ عظیم سے لے کر آج تک غیر مسلم قوموں نے مسلمانوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے، اور وہ کس طرح مسلمان ملکوں کو آپس میں تقسیم کرتی رہی ہیں کہ اچھا مصر تمہارا اور شام ہمارا، الجزائر تمہارا اور مراکش ہمارا، ہندوستان تمہارا اور برما ہمارا وغیرہ۔ گویا کہ آپس میں ایک دوسرے کی دعوت ہو رہی ہے کہ آؤ ان کو لے جاکر کھالو۔ (ابوداؤد)

مسلمان تنکوں کی طرح ہوں گے

جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی حالت صحابہ کرام کے سامنے بیان فرمائی تو کسی صحابی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا اس وقت ہماری تعداد بہت کم رہ جائے گی جس کی وجہ سے دوسرے لوگ مسلمانوں کو کھانے لگیں گے اور دسروں کو بھی کھانے کی دعوت دینے لگیں گے؟ جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں، اس وقت تمہاری تعداد بہت زیادہ ہوگی۔ چنانچہ آج مسلمانوں کی تعداد ایک ارب سے زیادہ ہے۔ گویا کہ دنیا کی ایک تہائی آبادی مسلمانوں کی ہے۔ لیکن تمہاری مثال ایسی ہوگی جیسے سیلاب میں بہتے ہوئے بے شمار تنکے ہوتے ہیں۔ یعنی جیسے ایک پانی کا سیلاب جارہا ہے اور اس میں بے شمار تنکے گرے ہوئے ہیں جن کی کوئی گنتی نہیں ہوسکتی، لیکن وہ تنکے سیلاب میں بہے چلے جارہے ہیں، ان تنکوں کی اپنی کوئی طاقت نہیں، اپنا کوئی فیصلہ نہیں، اپنا کوئی اختیار نہیں، پانی جہاں بہاکر لے جارہا ہے وہاں جارہے ہیں۔

مسلمان بُزدل ہو جائیں گے

آگے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہارا رعب نکال لیں گے اور تمہارے دلوں میں کمزوری اور بُزدلی آجائے گی" ایک صحابی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ کمزوری اور بُزدلی کیا چیز ہے؟ گویا کہ صحابہ کرامؓ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ مسلمان اور بُزدل؟ مسلمان اور کمزور؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کمزوری یہ ہے کہ دنیا کی محبّت دل میں آجائے گی اور موت سے نفرت ہو جائے گی۔ اور موت کا مطلب ہے "اللہ تعالیٰ سے ملاقات" گویا کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے نفرت ہو جائے گی۔ اور اس وقت یہ فکر ہوگی کہ دنیا حاصل ہو۔ پیسہ حاصل ہو۔ شہرت اور عزّت حاصل ہو۔ چاہے حلال طریقے سے ہو یا حرام طریقے سے ہو۔

صحابہ کرامؓ کی بہادری

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا حال یہ تھا کہ ایک غزوہ میں ایک صحابی اکیلے رہ گئے۔ سامنے سے تین چار کافر مسلح جنگجو پہلوان قسم کے آگئے، یہ صحابی تنہا تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اِن سے مقابلہ کرنا چاہا تو اتنے میں دوسرے صحابہ کرامؓ وہاں پہنچ گئے۔ اور انہوں نے کہا کہ تم اکیلے ہو اور یہ زیادہ ہیں اور بڑے جنگجو اور پہلوان قسم کے لوگ بھی ہیں۔ اس لئے اس وقت بہتر یہ ہے کہ طرح دے جاؤ اور مقابلہ نہ کرو۔ اور ہمارے لشکر کے آنے کا انتظار کرلو۔ ان صحابی نے بے ساختہ جواب دیا کہ میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ تم میرے اور جنّت کے درمیان حائل ہونے کی کوشش مت کرنا، یہ بڑے بڑے پہلوان تو میرے جنّت میں پہنچنے کا راستہ ہیں۔ اور تم مجھے لڑنے سے روک رہے ہو اور میرے اور جنّت کے درمیان حائل ہو رہے ہو۔ صحابہ کرامؓ کا یہ حال تھا جس کی وجہ سے ان کی سمجھ میں

نہیں آرہا تھا کہ بُزدلی کیا چیز ہے؟ اور کمزوری کیا چیز ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت ختم فرمادی تھی۔ اور ہر وقت آنکھوں سے آخرت کو دیکھ رہے تھے۔ جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کررہے تھے۔ اس وجہ سے مرنے سے نہیں ڈرتے تھے، بلکہ اس بات کی خواہش کرتے تھے کہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ جائیں۔

ایک صحابی کا شوقِ شہادت

ایک صحابی ایک میدانِ جنگ میں پہنچے، دیکھا کہ سامنے کفار کا لشکر ہے۔ جو پورے اسلحے اور طاقت کے ساتھ حملہ آور ہوگا، اس لشکر کو دیکھ کر بے ساختہ زبان سے یہ شعر پڑھا

غدا نلقی الاحبہ　　محمدا وصحبہ

واہ واہ کیا بہترین نظارہ ہے۔ کل کو ہم اپنے دوستوں سے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ملاقات کریں گے۔

ایک صحابی کے تیر آکر لگا۔ سینے سے خون کا فوارہ اُبل پڑا، اس وقت بے ساختہ زبان سے یہ کلمہ نکلا:

﴿فزت وربّ الکعبة﴾

"ربِ کعبہ کی قسم۔ آج میں کامیاب ہوگیا"۔

یہ حضرات ایمان اور یقین والے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ رکھنے والے تھے، دنیا کی محبت جن کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔

"فتنہ" کے دور کے لئے پہلا حکم

ایسی صورت میں ایک مسلمان کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے؟ اس کے بارے

میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا حکم یہ دیا کہ:

﴿تلزم جماعة المسلمين وامامهم﴾

پہلا کام یہ کرو کہ جمہور مسلمان اور ان کے امام کے ساتھ ہوجاؤ۔ اور جو لوگ بغاوت کررہے ہیں ان سے کنارہ کشی اختیار کرلو اور ان کو چھوڑ دو۔ ایک صحابی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر مسلمانوں کی اکثریت والی جماعت اور امام نہ ہو تو پھر آدمی کیا کرے؟ یعنی آپ نے جو حکم دیا وہ تو اس وقت ہے جب مسلمانوں کی متفقہ جماعت موجود ہو۔ اِن کا ایک سربراہ ہو جس پر سب متفق ہوں۔ اور اس امام کی دیانت اور تقویٰ پر اعتماد ہو، تب تو اس کے ساتھ چلیں گے، لیکن اگر نہ جماعت ہو اور نہ متفقہ امام ہو تو اس صورت میں ہم کیا کریں؟ جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسی صورت میں ہر جماعت اور ہر پارٹی سے الگ ہوکر زندگی گزارو اور اپنے گھروں کی ٹاٹ بن جاؤ۔ ٹاٹ جس سے بوریاں بنتی ہیں، پہلے زمانے میں اس کو بطور فرش کے بچھایا جاتا تھا۔ آج کل اس کی جگہ قالین بچھائے جاتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح گھر کا قالین اور فرش ہوتا ہے، جب ایک مرتبہ اس کو بچھادیا تو اب بار بار اس کو اس کی جگہ سے نہیں اٹھاتے، اسی طرح تم بھی اپنے گھروں کے ٹاٹ اور فرش بن جاؤ، اور بلا ضرورت گھر سے باہر نہ نکلو، اور ان جماعتوں کے ساتھ شمولیت اختیار مت کرو۔ بلکہ ان سے کنارہ کش ہوجاؤ۔ الگ ہوجاؤ۔ کسی کا ساتھ مت دو۔ اس سے زیادہ واضح بات اور کیا ہوسکتی ہے۔

"فتنہ" کے دور کے لئے دوسرا حکم

ایک حدیث میں فرمایا کہ جس وقت تم لوگوں سے کنارہ کش ہوکر زندگی گزار رہے ہو، اس وقت اگر مسلمان آپس میں لڑ رہے ہوں۔ اور ان کے درمیان قتل و غارت گری ہورہی ہو تو ان کو تماشہ کے طور پر بھی مت دیکھو۔ اِس لئے کہ جو

شخص تماشہ کے طور پر اِن فتنوں کی طرف جھانک کر دیکھے گا وہ فتنہ اس کو بھی اپنی طرف کھینچ لے گا اور اچک لے گا۔ من استشرف لھا استشرفتہ اس لئے ایسے وقت میں تماشہ دیکھنے کے لئے بھی گھر سے باہر نہ نکلو اور اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔

"فتنہ" کے دور کے لئے تیسرا حکم

ایک اور حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ فتنے ایسے ہوں گے کہ اس میں القائم فیھا خیر من الماشی، والقاعد فیھا خیر من القائم کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا۔ اور بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اس فتنے کے اندر کسی قسم کا حصہ مت لو۔ اس فتنے کی طرف چلنا بھی خطرناک ہے۔ چلنے سے بہتر یہ ہے کہ کھڑے ہو جاؤ۔ اور کھڑا ہونا بھی خطرناک ہے، اس سے بہتر یہ ہے کہ بیٹھ جاؤ۔ اور بیٹھنا بھی خطرناک ہے، اس سے بہتر یہ ہے کہ لیٹ جاؤ۔ گویا کہ اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنی ذاتی زندگی کو درست کرنے کی فکر کرو۔ اور گھر سے باہر نکل کر اجتماعی مصیبت اور اجتماعی فتنے کو دعوت مت دو۔

فتنہ کے دور کا بہترین مال

ایک اور حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس میں آدمی کا سب سے بہتر مال اس کی بکریاں ہوں گی۔ جس کو وہ لے کر پہاڑ کی چوٹی پر چلا جائے اور شہروں کی زندگی چھوڑ دے۔ اور ان بکریوں پر اکتفا کر کے اپنی زندگی بسر کرے۔ ایسا شخص سب سے زیادہ محفوظ ہوگا، کیونکہ شہروں میں اس کو ظاہری اور باطنی فتنے اچکنے کے لئے تیار ہوں گے۔

فتنہ کے دور کے لئے ایک اہم حکم

ان تمام احادیث کے ذریعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ وہ وقت اجتماعی اور جماعتی کام کا نہیں ہو گا۔ کیونکہ جماعتیں سب کی سب غیر معتبر ہوں گی، کسی بھی جماعت پر بھروسہ کرنا مشکل ہو گا۔ حق اور باطل کا پتہ نہیں چلے گا۔ اس لئے ایسے وقت میں اپنی ذات کو ان فتنوں سے بچاکر اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگاکر کسی طرح اپنے ایمان کو قبر تک لے جاؤ۔ ان فتنوں سے بچاؤ کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ جو آیت میں نے شروع میں تلاوت کی ہے، وہ بھی اسی سیاق میں آئی ہے۔ فرمایا کہ اے ایمان والو! اپنی ذات کی خبر لو۔ اپنے آپ کو درست کرنے کی فکر کرو۔ اگر تم ہدایت پر آگئے تو پھر جو لوگ گمراہی کی طرف جارہے ہیں ان کی گمراہی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی اگر تم نے اپنی اصلاح کی فکر کرلی۔ روایت میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ آیت تو بتا رہی ہے کہ بس انسان صرف اپنی فکر کرے اور دوسرے کی فکر نہ کرے۔ اور اگر کوئی دوسرا شخص غلط راستے پر جارہا ہے تو اس کو جانے دے اور اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے، اسکو تبلیغ نہ کرے۔ جبکہ دوسری طرف یہ حکم آیا ہے کہ امر بالمعروف بھی کرنا چاہئے، اور نہی عن المنکر بھی کرنا چاہئے، اور دوسروں کو نیکی کی دعوت اور تبلیغ بھی کرنی چاہئے تو اِن دونوں میں کس طرح تطبیق دی جائے؟

فتنہ کے دور کی چار علامتیں

جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ آیتیں بھی اپنی جگہ درست ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہئے اور دعوت و تبلیغ کرنی چاہئے لیکن ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس وقت انسان کے ذمے صرف اپنی اصلاح

کی فکر باقی رہے گی۔ اور یہ وہ زمانہ ہوگا جس میں چار علامتیں ظاہر ہوجائیں۔

① پہلی علامت یہ ہے کہ اس زمانے میں انسان اپنے مال کی محبت کے جذبے کے پیچھے لگا ہوا ہو۔ اور اپنے جذبۂ بخل کی اطاعت کررہا ہو۔ مال طلبی میں لگا ہوا ہو۔ صبح سے لے کر شام تک بس ذہن پر ایک ہی دُھن سوار ہو کہ جس طرح بھی ہو پیسے زیادہ آجائیں۔ دولت زیادہ ہوجائے۔ اور میری دنیا درست ہوجائے۔ اور ہر کام مال و دولت کی محبّت میں کررہا ہو۔

② دوسری علامت یہ ہے کہ لوگ ہر وقت خواہشاتِ نفس کی پیروی میں لگے ہوئے ہوں۔ جس طرف انسان کی خواہش اس کو لے جارہی ہو۔ وہ جارہا ہو۔ یہ نہ دیکھ رہا ہو کہ کام حلال ہے یا حرام ہے۔ اور نہ یہ دیکھ رہا ہو کہ یہ جنّت کا راستہ ہے یا جہنم کا راستہ ہے۔ یہ اللہ کی رضامندی کا راستہ ہے یا ناراضگی کا راستہ ہے، ان سب چیزوں کو بھول کر اپنی خواہشاتِ نفس کے پیچھے دوڑا جارہا ہو۔ یہ دوسری علامت ہے۔

③ تیسری علامت یہ ہے کہ جب دنیا کو آخرت پر ترجیح دی جانی لگے۔ یعنی آخرت کی تو بالکل فکر نہ ہو۔ لیکن دنیا کی اتنی زیادہ فکر ہو کہ لاکھ سمجھایا جائے اور بتایا جائے کہ آخرت آنے والی ہے۔ ایک دن مرنا ہے۔ اور قبر میں جانا ہے۔ اللہ کے سامنے پیشی ہوگی۔ ساری باتیں سمجھانے کے جواب میں وہ کہے کہ کیا کریں زمانہ ہی ایسا ہے، ہمیں آخر اسی دنیا میں سب کے ساتھ رہنا ہے، اس لئے اس دنیا کی بھی فکر کرنی چاہئے۔ گویا کہ ساری نصیحتوں اور وعظوں کو ہوا ہی میں اڑا دے اور اسکی طرف کان نہ دھرے اور دنیا کمانے میں لگ جائے۔

④ چوتھی علامت یہ ہے کہ ہر انسان اپنی رائے پر گھمنڈ میں مبتلا ہو۔ دوسرے کی سننے کو تیار ہی نہ ہو۔ اور ہر انسان نے اپنا ایک موقف اختیار کر رکھا ہو۔ اور اسی میں اس طرح وہ مگن ہو کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ درست ہے۔ اور جو بات دوسرا کہہ رہا ہے وہ غلط ہے۔ جیسے آج کل یہی منظر نظر آتا ہے کہ ہر انسان نے دین

کے معاملے میں بھی اپنی ایک رائے متعین کرلی ہے کہ اس کے نزدیک کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے۔ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے۔ حالانکہ ساری عمر میں کبھی ایک دن بھی قرآن و حدیث سمجھنے کے لئے خرچ نہیں کیا۔ لیکن جب اس کے سامنے شریعت کا کوئی حکم بیان کیا جائے تو فوراً یہ جواب دیتا ہے کہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ فوراً اپنی رائے پیش کرنی شروع کردیتا ہے۔ اسی کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر شخص اپنی رائے پر گھمنڈ میں مبتلا ہوگا۔

بہرحال، جس زمانے میں یہ چار علامتیں ظاہر ہوجائیں، یعنی جب مال کی محبت کی اطاعت ہونے لگے۔ لوگ خواہشاتِ نفس کے پیچھے پڑجائیں۔ دنیا کو آخرت پر ترجیح دی جارہی ہو۔ اور ہر شخص اپنی رائے پر گھمنڈ میں مبتلا ہو۔ اس وقت اپنی ذات کو بچانے کی فکر کرو۔ اور عام لوگوں کی فکر چھوڑ دو کہ عام لوگ کہاں جارہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ایک فتنہ ہے۔ اگر عام لوگوں کی فکر کے لئے باہر نکلو گے تو وہ عام لوگ تمہیں پکڑلیں گے۔ اور تمہیں بھی فتنے میں مبتلا کردیں گے، اس لئے اپنی ذات کی فکر کرو اور اپنے آپ کو اصلاح کے راستے پر لانے کی کوشش کرو۔ گھر سے باہر نہ نکلو۔ گھر کے دروازے بند کرلو۔ گھر کی ٹاٹ بن جاؤ، اور تماشہ دیکھنے کے لئے بھی گھر سے باہر مت جھانکو۔ فتنے کے زمانے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی تعلیم ہے۔

اِختلافات میں صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب صحابہ کرامؓ کا زمانہ آیا۔ اور خلافت راشدہ کے آخری دور میں بڑے زبردست اختلافات حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان پیش آئے۔ اور جنگ تک نوبت پہنچ گئی۔ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے درمیان

اِختلاف ہوا اور اس میں بھی جنگ کی نوبت پہنچی۔ ان اِختلاف کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کے زمانے میں ہی یہ سب کچھ دکھادیا تاکہ آنے والی امت کے لئے صحابہ کرامؓ ہی کی زندگی سے رہنمائی کا ایک راستہ مل جائے کہ جب کبھی آئندہ اس قسم کے واقعات پیش آئیں تو کیا کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس زمانے میں وہ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ جو یہ سمجھتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حق پر ہیں، انہوں نے اس حدیث پر عمل کیا جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ:

﴿تلزم جماعة المسلمين وامامهم﴾

"یعنی ایسے وقت میں جو مسلمانوں کی بڑی جماعت ہو اور اِس کا امام بھی ہو۔ اس کو لازم پکڑ لو"۔

اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ساتھ دیا اور یہ کہا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس وقت امام ہیں، ہم ان کا ساتھ دیں گے، اور وہ جیسا کہیں گے ہم ویسا ہی کریں گے۔ بعض صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو برحق سمجھا کہ یہ اِمام ہیں اور ان کا ساتھ دینا شروع کردیا۔ صحابہ کرامؓ کا تیسرا فریق وہ تھا جنہوں نے یہ کہا کہ اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ حق کیا ہے؟ اور باطل کیا ہے؟ اور ایسے موقع کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہ ہے کہ تمام جماعتوں سے الگ ہوجائیں۔ چنانچہ انہوں نے نہ تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ساتھ دیا اور نہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ساتھ دیا، بلکہ الگ ہوکر اپنے گھروں میں بیٹھ گئے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا طرزِ عمل

چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں۔ بڑے اونچے درجے کے صحابی اور فقیہ تھے۔ اس زمانے میں یہ

اپنے گھر میں بیٹھے تھے۔ ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں کہ گھر میں بیٹھ گئے، باہر حق و باطل کا معرکہ ہو رہا ہے، حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان لڑائی ہو رہی ہے، اس میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ساتھ دینا چاہئے، اس لئے کہ وہ برحق ہیں، تو آپ باہر کیوں نہیں نکلتے؟ جواب میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ میں نے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے کہ جب کبھی ایسا موقع آئے کہ مسلمان آپس میں ٹکرا جائیں اور حق و باطل کا پتہ نہ چلے تو اس وقت اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جاؤ، اور اپنے گھر کا ٹاٹ بن جاؤ۔ اور اپنے کمان کی تانتیں توڑ ڈالو، یعنی ہتھیار توڑ ڈالو۔ چونکہ مجھے حق و باطل کا پتہ نہیں چل رہا ہے، اس لئے میں اپنے ہتھیار توڑ کر گھر کے اندر بیٹھ گیا ہوں اور اللہ اللہ کر رہا ہوں۔

اس شخص نے کہا کہ یہ آپ غلط کر رہے ہیں، اسلئے کہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ:

﴿قٰتِلُوْهم حتی لا تکون فتنة﴾

"یعنی اس وقت تک جہاد کرو جب تک فتنہ باقی ہے۔ اور جب فتنہ ختم ہو جائے۔ اس وقت جہاد چھوڑ دینا"۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس کا کیا عجیب جواب اِرشاد فرمایا:

﴿قاتلنا حتی لم تکن فتنة، وقاتلتم حتی کانت الفتنة﴾

ہم نے جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر قتال کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فتنہ ختم فرما دیا تھا، اور اب تم نے قتال کیا تو فتنہ ختم نہیں کیا، بلکہ فتنہ کو اور بڑھا دیا اور اسے جگا دیا۔ اس لئے میں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر عمل کرتے ہوئے گھر میں بیٹھا ہوں۔

حالت امن اور حالت فتنہ میں ہمارے لئے طرزِ عمل

اسی بارے میں ایک محدث کا ایک قول میری نظر سے گزرا، جب میں نے اِس کو پڑھا تو مجھے وجد آگیا۔ وہ قول یہ ہے:

﴿اقتدوا بعمر رضی الله تعالى عنه في الامن وبابنه في الفتنة﴾

"یعنی جب امن کی حالت ہو تو اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اقتدا کرو۔ اور جب فتنہ کی حالت ہو تو ان کے بیٹے یعنی حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اقتدا کرو"۔

یعنی امن کی حالت میں یہ دیکھو کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کیا طرزِ عمل تھا۔ ان کی اقتدا کرتے ہوئے وہ طرزِ عمل تم بھی اختیار کرو۔ اور فتنہ کی حالت میں یہ دیکھو کہ ان کے بیٹے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ وہ یہ کہ تلوار توڑ کر گھر کے اندر الگ ہو کر بیٹھ گئے۔ اور کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ تم بھی فتنہ کی حالت میں ان کی اتباع کرو۔

اِختلافات کے باوجود آپس کے تعلّقات

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام ؓ ہی کے دور میں یہ سارے منظر دکھا دیئے، چنانچہ جن صحابہ کرام ؓ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حق پر سمجھا، انہوں نے ان کا ساتھ دیا۔ اور جنہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حق پر سمجھا، انہوں نے ان کا ساتھ دیا۔ لیکن ساتھ دینے کے باوجود یہ عجیب منظر دنیا کی آنکھوں نے دیکھا کہ ایسا منظر دنیا نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ یہ کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار بھی ہیں۔ لیکن جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لشکر میں سے کسی کا انتقال ہو جاتا تو حضرت معاویہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کے لشکر کے لوگ اس کے جنازے میں آکر شریک ہوتے، اور جب حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لشکر میں کسی کا انتقال ہوجاتا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لشکر کے لوگ اس کے جنازے میں شریک ہوتے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ لڑائی در حقیقت نفسانیت کی بنیاد پر نہیں تھی، یہ لڑائی جاہ اور مال کے حصول کے لئے نہیں تھی۔ بلکہ لڑائی کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کے حکم کا ایک مطلب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سمجھا تھا، یہ اس پر عمل کررہے تھے۔ اور حکم کا ایک مطلب حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سمجھا تھا، وہ اس پر عمل کررہے تھے. اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اللہ کے حکم کی تعمیل میں مشغول تھے۔

حضرت ابو ہریرۃؓ کا طرزِ عمل

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو پڑھنے پڑھانے والے صحابی تھے۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ مولوی قسم کے صحابی تھے۔ اور ہر وقت پڑھنے پڑھانے کے مشغلے میں رہتے تھے، ان کا طرزِ عمل یہ تھا کہ یہ دونوں لشکروں میں دونوں کے پاس جایا کرتے تھے، کسی ایک کا ساتھ نہیں دیتے تھے، جب نماز کا وقت آتا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لشکر میں جاکر ان کے پیچھے نماز پڑھتے، اور جب کھانے کا وقت آتا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں جاکر ان کے ساتھ کھانا کھاتے۔ کسی نے ان سے سوال کیا کہ حضرت: آپ نماز تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے پڑھتے ہیں، اور کھانا حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ کھاتے ہیں۔ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ جواب میں فرمایا کہ نماز وہاں اچھی ہوتی ہے اور کھانا وہاں اچھا ہوتا ہے۔ اس لئے نماز کے وقت وہاں اور کھانے کے وقت وہاں چلا جاتا ہوں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ہمیں آپس کے اختلافات کرنے کا سلیقہ بھی سکھا دیا۔

حضرت امیر معاویہؓ کا قیصر روم کو جواب

اس لڑائی کے عین دوران جب ایک دوسرے کی فوجیں آمنے سامنے ایک دوسرے کے خلاف کھڑی ہیں۔ اس وقت قیصر روم کا یہ پیغام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آتا ہے کہ میں نے سنا ہے کہ تمہارے بھائی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے، اور وہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتلوں سے قصاص نہیں لے رہے ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہاری مدد کے لئے بہت بڑا لشکر بھیج دوں تاکہ تم ان سے مقابلہ کرو۔ اس پیغام کا جو فوری جواب حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لکھ کر بھیجا۔ وہ یہ تھا کہ:

> "اے نصرانی بادشاہ! تو یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے آپس کے اختلاف کے نتیجے میں تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر حملہ آور ہوگا؟ یاد رکھ! اگر تو نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بُری نگاہ ڈالنے کی جرأت کی تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لشکر سے نمودار ہونے والا پہلا شخص جو تیری گردن اتارے گا وہ معاویہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہوگا"۔

تمام صحابہ کرامؓ ہمارے لئے معزّز اور مکرّم ہیں

آج کل لوگ حضرات صحابہ کرامؓ کے بارے میں کیسی کیسی زبان درازیاں کرتے ہیں۔ حالانکہ صحابہ کرامؓ کی شان اور مرتبے کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں ہے، ان کے مدارک اور جذبے کو ہم نہیں پہنچ سکتے، آج ہم ان کی لڑائیوں کو اپنی لڑائیوں پر قیاس کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ جس طرح ہمارے درمیان لڑائی ہوتی ہے، اسی طرح ان کے درمیان بھی لڑائی ہوئی۔ حالانکہ ان کی ساری لڑائیاں اور سارے اختلافات کے ذریعہ درحقیقت اللہ تعالیٰ آئندہ اُمت کے لئے رہنمائی کا

راستہ پیدا کررہے تھے کہ آئندہ زمانے میں جب کبھی ایسے حالات پیدا ہوجائیں تو امت کے لئے راستہ کیا ہے؟ چاہے وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوں، یا حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوں، یا الگ بیٹھنے والے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہوں۔ ان میں سے ہر ایک نے ہمارے لئے ایک اسوۂ حسنہ چھوڑا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کے دھوکے میں کبھی مت آنا جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان باہمی اختلافات کی بنیاد پر کسی ایک صحابی کی شان میں گستاخی یا زبان درازی کرتے ہیں۔ ارے ان کے مقام تک آج کوئی پہنچ نہیں سکتا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی لِلّٰہیت اور خلوص

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چونکہ اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد بنادیا تھا، جس کی وجہ سے ان کے بارے میں لوگ بہت سی باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جمعہ کے خطبے میں عین جمعہ کے وقت منبر پر کھڑے ہوکر یہ دعا کی کہ یا اللہ! میں نے اپنے بیٹے یزید کو جو اپنا ولی عہد بنایا ہے، میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ اس کو ولی عہد بناتے وقت میرے ذہن میں سوائے امت محمدیہ کی فلاح کے کوئی اور بات نہیں تھی۔ اور اگر میرے ذہن میں کوئی بات ہو تو میں یہ دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ! قبل اِس کے کہ میرا یہ حکم نافذ ہو، آپ اس کی روح قبض کرلیں۔ دیکھئے! کوئی باپ اپنے بیٹے کے لئے ایسی دعا نہیں کیا کرتا، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ دعا فرمائی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو کچھ کیا وہ خلوص کے ساتھ کیا۔ انسان سے غلطی ہوسکتی ہے۔ پیغمبروں کے علاوہ ہر ایک سے غلطی ہوسکتی ہے۔ غلط فیصلہ ہوسکتا ہے۔ لیکن آپ نے جو کچھ فیصلہ کیا وہ اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے کیا۔

کنارہ کش ہوجاؤ

بہر حال، حضرات صحابہ کرام ؓ نے فتنوں کی تمام احادیث پر عمل کرکے ہمارے لئے نمونہ پیش کردیا کہ فتنے میں یہ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جب اس دور میں جہاں مقابلہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا تھا۔ اِس دور میں بھی صحابہ کرام ؓ کی ایک بڑی جماعت الگ ہوکر بیٹھ گئی تھی۔ جس میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے صحابہ کرام ؓ شامل تھے، تو اس دور میں بھی جب حق و باطل کا یقینی طور پر پتہ نہیں ہے، بلکہ حق و باطل مشتبہ ہے، اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ آدمی کنارہ کشی اختیار کرلے۔

حقیقت یہ ہے کہ تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ کو عجیب بات منظور تھی کہ جو حضرات صحابہ کرام ؓ اس زمانے میں کنارہ کش ہوکر بیٹھ گئے تھے، ان سے اللہ تعالیٰ نے دین کی بہت بڑی خدمت لے لی۔ ورنہ اگر سب کے سب صحابہ جنگ میں شامل ہوجاتے تو بہت سے صحابہ ؓ ان میں سے شہید ہوجاتے۔ اور دین کی وہ خدمت نہ کرپاتے۔ چنانچہ جو حضرات صحابہ کرام ؓ الگ ہوکر بیٹھ گئے تھے، انہوں نے احادیث کو مدون کرنا شروع کردیا۔ اور اس کے نتیجے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کا لایا ہوا دین آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے مدون اور مرتب ہوگیا۔ اور ایک بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے۔

اپنی اصلاح کی فکر کرو

بہرحال، فتنہ کے دور میں یہ حکم دیا کہ گھر کا دروازہ بند کرکے بیٹھ جاؤ اور اللہ اللہ کرو۔ اور اپنی اصلاح کی فکر کرو کہ میں گناہوں سے بچ جاؤں۔ اور اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار بن جاؤں۔ اور میرے بیوی بچے بھی مطیع اور فرمانبردار بن جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک پیغمبر ہی ایسا نسخہ بتاسکتا ہے، ہر انسان کے بس کا کام نہیں کہ

وہ ایسا نسخہ بتا سکے، اس لئے اس نسخے پر عمل کرتے ہوئے ہر انسان اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوجائے۔ معاشرہ تو انہی افراد کے مجموعے کا نام ہے، جب ایک فرد کی اصلاح ہوگئی اور وہ درست ہوگیا تو کم از کم معاشرے سے ایک بُرائی تو دور ہوگئی۔ اور جب دوسرا فرد درست ہوگیا تو دوسری بُرائی درست ہوگئی۔ اسی طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اور افراد سے معاشرہ بنتا ہے۔ آہستہ آہستہ سارا معاشرہ درست ہوجائے گا۔

اپنے عیوب کو دیکھو

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں، یہ شدید فتنے کا دور ہے۔ اس کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو سال پہلے یہ نسخہ بتاگئے کہ کسی پارٹی میں شامل مت ہونا، حتی الامکان گھر میں بیٹھو۔ اور تماشہ دیکھنے کے لئے بھی گھر سے باہر مت جاؤ۔ اور اپنی اصلاح کی فکر کرو۔ اور یہ دیکھو کہ میرے اندر کیا بُرائی ہے۔ اور میں کن بُرائیوں کے اندر مبتلا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ پورے معاشرے کے اندر جو فتنہ پھیلا ہوا ہے، وہ میرے گناہوں کی نحوست ہو۔ ہر انسان کو یہ سوچنا چاہئے کہ یہ جو کچھ ہورہا ہے، شاید میرے گناہوں کی وجہ سے ہورہا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس لوگ قحط سالی کی شکایت کرنے گئے تو انہوں نے کہا کہ یہ سب میرے گناہوں کی وجہ سے ہورہا ہے، میں یہاں سے چلا جاتا ہوں، شاید اللہ تعالیٰ تم پر رحمت نازل فرمادے۔ آج ہم لوگوں کو دوسروں پر تبصرہ کرنا آتا ہے کہ لوگ یوں کررہے ہیں۔ لوگوں کے اندر یہ خرابیاں ہیں، جس کی وجہ سے فساد ہورہا ہے، لیکن اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنے والا شاذ و نادر ہی آج کوئی ملے گا۔ اس لئے دوسروں کو چھوڑو اور اپنی اِصلاح کی فکر کرو۔

گناہوں سے بچاؤ

اور اپنی اصلاح کی فکر کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ صبح سے لے کر شام تک جو گناہ تم سے سرزد ہوتے ہیں، ان کو ایک ایک کر کے چھوڑنے کی فکر کرو۔ اور ہر روز اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ اور استغفار کرو۔ اور یہ دعا کرو کہ یا اللہ! یہ فتنہ کا زمانہ ہے۔ مجھے اور میرے گھر والوں اور میری اولاد کو اپنی رحمت سے اس فتنہ سے دور رکھئے۔

﴿اللھم انا نعوذ بک من الفتن ما ظھر منھا وما بطن﴾

"اے اللہ! ہم آپ کی تمام ظاہری اور باطنی فتنوں سے پناہ مانگتے ہیں"۔

دعا کرنے کے ساتھ ساتھ غیبت سے، نگاہ کے گناہ سے، فحاشی اور عُریانی کے گناہوں سے، اور دوسروں کی دل آزاری کے گناہ سے، رشوت کے گناہ سے، سُود کے گناہ سے اپنے آپ کو جتنا ہوسکے ان سے بچانے کی کوشش کرو۔ لیکن اگر غفلت میں یہ زندگی گزار دی تو پھر اللہ تعالیٰ بچائے۔ انجام بڑا خراب نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مرنے سے پہلے
موت کی تیاری کیجئے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تاریخ خطاب ۳۱ر مئی ۱۹۹٦ء

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم

گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر ۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرنے سے پہلے موت کی تیّاری کیجئے

الحمدلله نحمده ونستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيات اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريک له ونشهد ان سيدنا وسندنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى اله واصحابه وبارک وسلم تسليما كثيرا كثيرا۔

اما بعد!

﴿فقد قال النبی صلی الله علیه وسلم : موتوا قبل ان تموتوا وحاسبوا قبل ان تحاسبوا﴾ (کشف الخفاء ۲:۲.۲:۳)

یہ ایک حدیث ہے جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ مرنے سے پہلے مرو۔ اور قیامت کے روز جو حساب و کتاب ہونا ہے اس سے پہلے اپنا حساب اور اپنا جائزہ لو۔

موت یقینی چیز ہے

موت ضرور آنے والی ہے۔ اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ اور موت کے مسئلہ میں آج تک کسی کا اختلاف نہیں ہوا اور نہ کسی نے اس کے آنے کا انکار کیا۔ انکار کرنے والوں نے نعوذ باللہ خدا کا انکار کردیا کہ ہم اللہ کو نہیں مانتے، رسولوں کا انکار کردیا، مگر موت کا انکار نہیں کرسکے۔ ہر شخص یہ بات مانتا ہے کہ جو شخص اس دنیا میں آیا ہے، وہ ایک نہ ایک دن ضرور موت کے منہ میں جائے گا۔ اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں، ہو سکتا ہے کہ ابھی موت آجائے۔ ایک منٹ کے بعد آجائے۔ ایک گھنٹہ کے بعد آجائے۔ ایک دن کے بعد آجائے۔ ایک ہفتہ کے بعد آجائے۔ ایک ماہ بعد آجائے۔ یا ایک سال کے بعد آجائے۔ کچھ پتہ نہیں۔ آج سائنس کی تحقیقات کہاں سے کہاں بام عروج تک پہنچ گئیں۔ لیکن سائنس یہ نہیں بتا سکتی کہ کونسا انسان کب مرے گا۔

موت سے پہلے مرنے کا مطلب

لہٰذا یہ یقینی بات ہے کہ موت ضرور آئے گی۔ اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ موت کا وقت متعین نہیں۔ اب اگر انسان غفلت کی حالت میں دنیا سے چلا جائے تو وہاں پہنچ کر خدا جانے کیا حالات پیش آئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں پہنچ کر اللہ کے غضب اور اس کے عذاب کا سامنا کرنا پڑے، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ اس حقیقی موت کے آنے سے پہلے مرو۔ کس طرح مرو؟ موت سے پہلے مرنے کا کیا مطلب؟ علماء کرام نے اس کے دو مطلب بیان فرمائے ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ حقیقی موت کے آنے سے پہلے تم اپنی وہ نفسانی خواہشات جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے معارض اور مقابل ہیں اور تمہارے دل میں گناہ کرنے کے اور ناجائز کام کرنے کے اور اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی کرنے کے جو داعیے اور تقاضے دل میں پیدا ہوتے رہتے

ہیں، ان کو کچل دو اور فنا کردو اور مار دو۔

مجھے ایک دن مرنا ہے

دوسرا مطلب علماء نے یہ بتایا کہ مرنے سے پہلے اپنے مرنے کا دھیان کو لو۔ کبھی کبھی یہ سوچا کرو کہ ایک دن مجھے اس دنیا سے جانا ہے۔ اور اس دنیا سے خالی ہاتھ جاؤں گا، نہ پیسے ساتھ جائیں گے، نہ اولاد ساتھ جائے گی۔ نہ کوٹھی بنگلے ساتھ جائیں گے، نہ دوست احباب ساتھ جائیں گے۔ بلکہ اکیلا خالی ہاتھ جاؤں گا، اس کو ذرا سوچا کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ہم سے جو ظلم، نافرمانیاں اور جرائم اور گناہ ہوتے ہیں، ان کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انسان نے اپنی موت کو بُھلا دیا ہے۔ جب تک جسم میں صحت اور قوت ہے، اور یہ ہاتھ پاؤں چل رہے ہیں، اس وقت تک انسان یہ سوچتا ہے کہ "ہم چوں ما دیگرے نیست" یعنی ہم سے بڑا کوئی نہیں۔ اور زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ اس وقت تکبّر بھی کرتا ہے، شیخی بھگارتا ہے، دوسروں پر ظلم بھی کرتا ہے، دوسروں کے حقوق پر ڈاکے بھی ڈالتا ہے، صحت اور جوانی کی حالت میں یہ سب کام کرتا رہتا ہے، اور یہ دھیان اور خیال بھی نہیں آتا کہ ایک دن مجھے بھی اس دنیا سے جانا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے پیاروں کو مٹی دے کر آتا ہے، اپنے پیاروں کا جنازہ اٹھاتا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ سوچتا ہے کہ موت کا واقعہ اس کے ساتھ پیش آیا ہے، میرے ساتھ تو پیش نہیں آیا۔ اس طرح غفلت کے عالم میں زندگی گزارتا ہے، اور موت کی تیاری نہیں کرتا۔

دو عظیم نعمتیں اور ان سے غفلت

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا کہ:

﴿نعمتان مغبون فيهما كثير من الناس الصحة والفراغ﴾
(صحیح بخاری، کتاب الرقائق، باب ماجاء فی الصحۃ والفراغ، حدیث نمبر ۶۰۴۹)

یعنی اللہ تعالیٰ کی دو نعمتیں ایسی ہیں جس کی طرف سے بہت سے انسان دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، ایک صحت کی نعمت اور ایک فراغت کی نعمت۔ یعنی جب تک "صحت" کی نعمت حاصل ہے اس وقت تک اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ یہ صحت کی نعمت ہمیشہ باقی رہے گی۔ اور صحت کی حالت میں اچھے اور نیک کاموں کو ٹلاتے رہتے ہیں کہ چلو یہ کام کل کرلیں گے۔ کل نہیں تو پرسوں کرلیں گے، لیکن ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ صحت کا وقت گزر جاتا ہے۔ دوسری نعمت ہے "فراغت" یعنی اس وقت اچھے کام کرنے کی فرصت ہے، وقت ملتا ہے، لیکن انسان اچھے کام کو یہ سوچ کر ٹال دیتا ہے کہ ابھی تو وقت ہے، بعد میں کرلیں گے۔ ابھی تو جوانی ہے، اور وہ اس جوانی کے عالم میں بڑے بڑے پہاڑ ڈھو سکتا ہے، بڑے سے بڑے مشقت کے کام انجام دے سکتا ہے، اگر چاہے تو جوانی کے عالم میں خوب عبادت کرسکتا ہے، ریاضتیں اور مجاہدات کرسکتا ہے، خدمت خلق کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے اپنے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا ڈھیر لگا سکتا ہے۔ لیکن دماغ میں یہ بات بیٹھی ہے کہ ابھی تو میں جوان ہوں، ذرا زندگی کا مزہ لے لوں، عبادت کرنے اور نیک کام کرنے کے لئے بہت عمر پڑی ہے، بعد میں کرلوں گا۔ اس طرح وہ نیک کاموں کو ٹلاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جوانی ڈھل جاتی ہے، اور اس کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ یہاں تک صحت خراب ہوجاتی ہے، اور اس کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اب جوانی کے جانے کے بعد عبادت اور نیک کام کرنا بھی چاہتا ہے تو جسم میں طاقت اور قوت نہیں ہے۔ یا فرصت نہیں ہے، اس لئے کہ اب مصروفیت اتنی ہوگئی ہے کہ وقت نہیں ملتا۔

یہ سب باتیں اس لئے پیدا ہوئیں کہ انسان موت سے غافل ہے۔ موت کا دھیان نہیں، اگر روزانہ صبح و شام موت کو یاد کرتا کہ ایک دن مجھے مرنا ہے اور مرنے سے پہلے مجھے یہ کام کرنا ہے تو پھر موت کی یاد اور اس کا دھیان انسان کو گناہوں سے بچاتا ہے، اور

نیکی کے راستے پر چلاتا ہے۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ ارشاد فرمارہے ہیں کہ مرنے سے پہلے مرو۔

حضرت بہلول رحؒ کا نصیحت آموز واقعہ

ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ۔ یہ مجذوب قسم کے بزرگ تھے، بادشاہ ہارون رشید کا زمانہ تھا۔ ہارون رشید ان مجذوب سے ہنسی مذاق کرتا رہتا تھا۔ اگرچہ مجذوب تھے لیکن بڑی حکیمانہ باتیں کیا کرتے تھے۔ ہارون رشید نے اپنے دربانوں سے کہہ دیا تھا کہ جب یہ مجذوب میرے پاس ملاقات کے لئے آنا چاہیں تو ان کو آنے دیا جائے۔ ان کو روکا نہ جائے۔ چنانچہ جب ان کا دل چاہتا دربار میں پہنچ جاتے۔ ایک دن یہ دربار میں آئے تو اس وقت ہارون رشید کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، ہارون رشید نے ان مجذوب کو چھیڑتے ہوئے کہا کہ: بہلول صاحب! آپ سے میری ایک گزارش ہے۔ بہلول نے پوچھا کیا ہے؟ ہارون رشید نے کہا کہ میں آپ کو یہ چھڑی بطور امانت کے دیتا ہوں۔ اور دنیا کے اندر آپ کو اپنے سے زیادہ کوئی بیوقوف آدمی ملے، اس کو یہ چھڑی میری طرف سے ھدیہ میں دے دینا۔ بہلول نے کہا: بہت اچھا۔ یہ کہہ کر چھڑی رکھ لی۔

بادشاہ نے تو بطور مذاق کے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ اور بتانا یہ مقصود تھا کہ دنیا میں تم سب سے زیادہ بے وقوف ہو۔ تم سے زیادہ بے وقوف کوئی نہیں ہے۔ بہرحال، بہلول وہ چھڑی لے کر چلے گئے۔

اس واقعہ کو کئی سال گزر گئے، ایک روز بہلول کو پتہ چلا کہ ہارون رشید بہت سخت بیمار ہیں۔ اور بستر سے لگے ہوئے ہیں، اور علاج ہو رہا ہے، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ یہ بہلول مجذوب بادشاہ کی عیادت کے لئے پہنچ گئے۔ اور پوچھا کہ امیر المؤمنین! کیا حال ہے؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ حال کیا پوچھتے ہو، سفر درپیش ہے۔ بہلول نے پوچھا: کہاں کا سفر درپیش ہے؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ آخرت کا سفر درپیش ہے، دنیا سے

اب جارہا ہوں۔ بہلول نے سوال کیا، کتنے دن میں واپس آئیں گے؟ ہارون نے کہا: بھائی یہ آخرت کا سفر ہے، اس سے کوئی واپس نہیں آیا کرتا۔ بہلول نے کہا: اچھا آپ واپس نہیں آئیں گے تو آپ نے سفر کے راحت اور آرام کے انتظامات کے لئے کتنے لشکر اور فوجی آگے بھیجے ہیں؟ بادشاہ نے جواب میں کہا: تم پھر بے وقوفی جیسی باتیں کررہے ہو۔ آخرت کے سفر میں کوئی ساتھ نہیں جایا کرتا۔ نہ باڈی گارڈ جاتا ہے، نہ لشکر، نہ فوج اور نہ سپاہی جاتا ہے۔ وہاں تو انسان تنہا ہی جاتا ہے۔ بہلول نے کہا کہ اتنا لمبا سفر کہ وہاں سے واپس بھی نہیں آنا ہے، لیکن آپ نے کوئی فوج اور لشکر نہیں بھیجا۔ حالانکہ اس سے پہلے آپ کے جتنے سفر ہوتے تھے، اس میں انتظامات کے لئے آگے سفر کا سامان اور لشکر جایا کرتا تھا۔ اس سفر میں کیوں نہیں بھیجا؟ بادشاہ نے کہا کہ نہیں، یہ سفر ایسا ہے کہ اس سفر میں کوئی لاؤ لشکر اور فوج نہیں بھیجی جاتی۔ بہلول نے کہا: بادشاہ سلامت! آپ کی ایک امانت بہت عرصے سے میرے پاس رکھی ہے، وہ ایک چھڑی ہے، آپ نے فرمایا تھا کہ مجھ سے زیادہ کوئی بے وقوف تمہیں ملے تو اس کو دے دینا۔ میں نے بہت تلاش کیا، لیکن مجھے اپنے سے زیادہ بے وقوف آپ کے علاوہ کوئی نہیں ملا، اس لئے کہ میں یہ دیکھا کرتا تھا کہ اگر آپ کا چھوٹا سا بھی سفر ہوتا تھا تو مہینوں پہلے سے اس کی تیاری ہوا کرتی تھی، کھانے پینے کا سامان، خیمے، لاؤ لشکر، باڈی گارڈ سب پہلے سے بھیجا جاتا تھا۔ اور اب یہ اتنا لمبا سفر جہاں سے واپس بھی نہیں آنا ہے، اس کے لئے کوئی تیاری نہیں ہے۔ آپ سے زیادہ دنیا میں مجھے کوئی بے وقوف نہیں ملا۔ لہٰذا آپ کی یہ امانت آپ کو واپس کرتا ہوں۔

یہ سن کر ہارون رشید رو پڑا، اور کہا: بہلول! تم نے سچی بات کی۔ ساری عمر ہم تم کو بے وقوف سمجھتے رہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکمت کی بات تم نے ہی کہی۔ واقعۃً ہم نے اپنی عمر ضائع کردی۔ اور اس آخرت کے سفر کی کوئی تیاری نہیں کی۔

عقل مند کون؟

در حقیقت حضرت بہلول نے جو بات کی وہ حدیث ہی کی بات ہے، حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿الکیس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت﴾

(ترمذی، باب صفۃ القیامۃ، باب نمبر ۳۶)

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیا کہ عقل مند کون ہوتا ہے؟ آج کی دنیا میں عقل منداس شخص کو کہا جاتا ہے جو مال کمانا خوب جانتا ہو۔ دولت کمانا اور پیسے سے پیسے بنانا خوب جانتا ہو، دنیا کو بے وقوف بنانا خوب جانتا ہو۔ لیکن اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عقل مند انسان وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو کرے اور نفس کی ہر خواہش کے پیچھے نہ چلے۔ بلکہ اس نفس کو اللہ کی مرضی کے تابع بنائے، اور مرنے کے بعد کے لئے تیاری کرے، ایسا شخص عقل مند ہے۔ اگر یہ کام نہیں کرتا تو وہ بے وقوف ہے کہ ساری عمر فضولیات میں گنوادی۔ جس جگہ ہمیشہ رہنا ہے وہاں کی کچھ تیاری نہ کی۔

ہم سب بے وقوف ہیں

جو بات بہلول نے ہارون رشید کے لئے کہی، اگر غور کروگے تو یہ بات ہم میں سے ہر شخص پر صادق آرہی ہے۔ اس لئے کہ ہم میں سے ہر شخص کو دنیا میں رہنے کے لئے ہر وقت یہ فکر سوار رہتی ہے کہ مکان کہاں بناؤں؟ کس طرح کا بناؤں؟ اس میں کیا کیا راحت و آرام کی اشیاء جمع کروں؟ اگر دنیا میں کہیں سفر پر جاتے ہیں تو کئی دن پہلے سے بکنگ کراتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں سیٹ نہ ملے۔ کئی دن پہلے سے اس سفر کی تیاری شروع ہوجاتی ہے۔ جس جگہ پہنچنا ہے وہاں پر پہلے سے اطلاع دی جاتی ہے، ہوٹل کی بکنگ کرائی جاتی ہے، پہلے سے یہ سب کام کئے جاتے ہیں۔ اور سفر صرف تین

دن کا ہے۔ لیکن جس جگہ ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے، جہاں کی زندگی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کے لئے یہ فکر نہیں کہ وہاں کا مکان کیسے بناؤں؟ وہاں کے لئے کس طرح بکنگ کراؤں؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ عقل مند شخص وہ ہے جو مرنے کے بعد کے لئے تیاری کرے۔ ورنہ وہ بے وقوف ہے، چاہے وہ کتنا ہی بڑا مال دار اور سرمایہ دار کیوں نہ بن جائے۔ اور آخرت کی تیاری کا راستہ یہ ہے کہ موت سے پہلے موت کا دھیان کرو کہ ایک دن مجھے اس دنیا سے جانا ہے۔

موت اور آخرت کا تصوّر کرنے کا طریقہ

حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ دن میں کوئی وقت تنہائی کا نکالو، پھر اس وقت میں ذرا سا اس بات کا تصوّر کیا کرو کہ میرا آخری وقت آگیا ہے، فرشتہ روح قبض کرنے کے لئے پہنچ گیا، اس نے میری روح قبض کرلی، میرے عزیز واقارب نے میرے غسل اور کفن دفن کا انتظام شروع کردیا۔ بالآخر مجھے غسل دے کر کفن پہنا کر اٹھا کر قبرستان لے گئے۔ نماز جنازہ پڑھ کر مجھے ایک قبر میں رکھا، پھر اس قبر کو بند کردیا، اور اوپر سے منوں مٹی ڈال کر وہاں سے رخصت ہوگئے۔ اب میں اندھیری قبر میں تنہا ہوں، اتنے میں سوال وجواب کے لئے فرشتے آگئے، وہ مجھ سے سوال وجواب کر رہے ہیں۔

اس کے بعد آخرت کا تصوّر کرو کہ مجھے دوبارہ قبر سے اٹھایا گیا، اب میدانِ حشر قائم ہے، تمام انسان میدانِ حشر کے اندر جمع ہیں، وہاں شدید گرمی لگ رہی ہے، پسینہ بہہ رہا ہے، سورج بالکل قریب ہے۔ ہر شخص پریشانی کے عالم میں ہے، اور لوگ جا کر انبیاء علیہم السلام سے سفارش کرا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں کہ حساب وکتاب شروع ہو۔ پھر اسی طرح حساب وکتاب، پل صراط اور جنّت اور جہنّم کا تصوّر کرے۔ روزانہ فجر کی نماز کے بعد تلاوت، مناجات مقبول اور اپنے ذکر واذکار سے فارغ ہونے کے بعد تھوڑا سا تصوّر کرلیا کرو کہ یہ وقت آنے والا ہے، اور کچھ پتہ نہیں

کب آجائے۔ کیا پتہ آج ہی آجائے۔ یہ تصور کرنے کے بعد دعا کرو کہ یا اللہ! میں دنیا کے کاروبار اور کام کاج کے لئے نکل رہا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسا کام کر گزروں جو میری آخرت کے اعتبار سے میرے لئے ہلاکت کا باعث ہو۔ روزانہ یہ تصور کر لیا کرو، جب ایک مرتبہ موت کا دھیان اور تصور دل میں بیٹھ جائے گا تو انشاء اللہ اپنی اصلاح کرنے کی طرف توجہ اور فکر ہو جائے گی۔

حضرت عبد الرحمٰن بن ابی نُعم رحمۃ اللہ علیہ

ایک بہت بڑے بزرگ اور محدث گزرے ہیں، حضرت عبد الرحمٰن بن ابی نعم رحمۃ اللہ علیہ، ان کے زمانے میں ایک شخص کے دل میں یہ خیال آیا کہ میں مختلف محدثین، علماء اور فقہاء اور بزرگانِ دین سے یہ سوال کروں کہ اگر آپ کو یہ پتہ چل جائے کہ کل آپ کی موت آنے والی ہے، اور آپ کی زندگی کا صرف ایک دن باقی ہے تو آپ وہ ایک دن کس طرح گزاریں گے، اور کن کاموں میں یہ دن گزاریں گے؟ سوال کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس سوال کے جواب میں یہ بڑے بڑے محدثین، علماء، بزرگانِ دین بہترین کاموں کا ذکر کریں گے، اور اس دن کو بہترین کاموں میں خرچ کریں گے، اس طرح مجھے بہترین کاموں کا پتہ چل جائے گا اور میں آئندہ اپنی زندگی میں وہ بہترین کام انجام دوں گا۔ اس خیال سے انہوں نے بہت سے بزرگوں سے یہ سوال کیا۔ اب اس سوال کے جواب میں کسی نے کچھ کہا، اور کسی نے کچھ کہا، لیکن وہ شخص جب حضرت عبد الرحمٰن بن أبی نعم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا، اور یہ سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ میں وہی کام کروں گا جو روزانہ کرتا ہوں، اس لئے کہ میں نے پہلے دن سے اپنا نظام الاوقات اور اپنے معمولات اس خیال کو سامنے رکھ کر بنایا ہے کہ شاید یہ دن میری زندگی کا آخری دن ہو، اور آج مجھے موت آجائے۔ اس نظام الاوقات کے اندر اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں کسی اور عمل کا اضافہ کر سکوں۔ جو عمل روزانہ کرتا ہوں، آخری دن بھی وہی عمل کروں گا۔ یہ ہے اس حدیث کا مصداق کہ:

﴿موتوا قبل ان تموتوا﴾

انہوں نے موت کا دھیان اور اس کا استحضار کر کے اپنی زندگی کو اس طرح ڈھال لیا کہ ہر وقت مرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ جب آنا چاہے آجائے۔

اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق

اسی کے بارے میں حدیث شریف میں فرمایا کہ:

﴿من احبّ لقاء الله احبّ الله لقاءه﴾

(صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب من احبّ لقاء اللہ)

جو اللہ تعالیٰ سے ملنا پسند کرتا ہے، اور اس کو اللہ تعالیٰ سے ملنے کا شوق ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو بھی اس سے ملنے کا شوق ہوتا ہے۔ ایسے لوگ تو ہر وقت موت کی انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں کہ:

غداً نلقى الاحبه محمداً وحزبه

کل کو اپنے دوستوں سے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے ملاقات ہوگی۔ اسی موت کے دھیان کے نتیجے میں زندگی شریعت اور اتباع سُنّت کے اندر ڈھل جاتی ہے، اور ہر وقت موت کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ بہرحال، تھوڑا سا وقت نکال کر موت کا تصوّر کیا کرو کہ موت آنے والی ہے، اس کے لئے میں نے کیا تیاری کی ہے۔

آج ہی اپنا محاسبہ کر لو

اس حدیث کے دوسرے جملے میں ارشاد فرمایا:

﴿حاسبوا قبل ان تحاسبوا﴾

اپنا حساب لیا کرو قبل اس کے کہ تمہارا حساب لیا جائے۔ آخرت میں تمہارے ایک ایک عمل کا حساب لیا جائے گا۔

﴿فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ
شرا یرہ ○﴾ (سورۃ الزلزال)

یعنی تم نے جو اچھا کام کیا ہوگا وہ بھی سامنے آجائے گا، اور جو بُرا کام کیا ہوگا وہ بھی سامنے آجائے گا۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

تم آج ہوا سمجھو جو روزِ جزا ہوگا

قیامت کے روز جو حساب لیا جائے گا تم اس سے پہلے ہی اپنا حساب لینا شروع کردو، یعنی روزانہ رات کو حساب لو کہ آج جو میرا سارا دن گزرا، اس میں کونسا عمل ایسا ہے کہ اگر اس عمل کے بارے میں قیامت کے روز مجھ سے پوچھا گیا کہ یہ عمل کیوں کیا تھا؟ تو اس کا کیا جواب دوں گا۔ روزانہ اس طرح کرلیا کرو۔

صبح کے وقت نفس سے "معاہدہ" (مشارطہ)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اصلاح کا ایک عجیب و غریب طریقہ تجویز فرمایا ہے۔ اگر ہم لوگ اس طریقے پر عمل کریں تو وہ اصلاح کے لئے نسخۂ اکسیر ہے۔ اس سے بہتر کوئی نسخہ ملنا مشکل ہے۔ فرماتے ہیں کہ روزانہ چند کام کرلیا کرو۔ ایک یہ کہ جب تم صبح کو بیدار ہو تو اپنے نفس سے ایک معاہدہ کرلیا کرو کہ آج کے دن میں صبح سے لے کر رات کو سونے تک کوئی گناہ نہیں کروں گا، اور میرے ذمے جتنے فرائض و واجبات اور سُنّتیں ہیں، ان کو بجالاؤں گا، اور جو میرے ذمے حقوق اللہ اور حقوق العباد ہیں، ان کو پورے طریقے سے ادا کروں گا۔ اگر غلطی سے اس معاہدہ کے خلاف کوئی عمل ہوا تو اے نفس! اس عمل پر تجھے سزا دوں گا۔ یہ معاہدہ ایک کام ہوا۔ جس کا نام ہے "مشارطہ" یعنی آپس میں شرط لگانا۔

معاہدہ کے بعد دعا

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی اس

پہلی بات پر تھوڑا اضافہ فرماتے ہوئے فرمایا کرتے کہ یہ معاہدہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے کہو کہ یا اللہ! میں نے یہ معاہدہ کرلیا ہے کہ آج کے دن گناہ نہیں کروں گا، اور فرائض وواجبات سب ادا کروں گا، شریعت کے مطابق چلوں گا، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پابندی کروں گا۔ لیکن یا اللہ! آپ کی توفیق کے بغیر میں اس معاہدے پر قائم نہیں رہ سکتا، اس لئے جب میں نے یہ معاہدہ کرلیا ہے تو آپ میرے اس معاہدے کی لاج رکھ لیجئے، اور مجھے اس معاہدے پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائیے، اور مجھے عہد شکنی سے بچالیجئے، اور مجھے اس معاہدے پر پوری طرح عمل کرنے کی توفیق عطا فرما دیجئے۔ یہ دعا کرلو۔

پورے دن اپنے اعمال کا ”مراقبہ“

دعا کرنے کے بعد زندگی کے کاروبار کے لئے نکل جاؤ۔ اگر ملازمت کرتے ہو تو ملازمت پر چلے جاؤ۔ اگر تجارت کرتے ہو تو تجارت کے لئے نکل جاؤ۔ اگر دوکان پر بیٹھتے ہو تو وہاں چلے جاؤ۔ وہاں جاکر یہ کرو کہ ہر کام شروع کرنے سے پہلے ذرا سوچ لیا کرو کہ یہ کام میرے اس معاہدے کے خلاف تو نہیں ہے، یہ لفظ جو زبان سے نکال رہا ہوں، یہ اس معاہدے کے خلاف تو نہیں ہے؟ اگر خلاف نظر آئے تو اس سے بچنے کی کوشش کرو۔ اس کو ”مراقبہ“ کہا جاتا ہے، یہ دوسرا کام ہے۔

سونے سے پہلے ”محاسبہ“

تیسرا کام رات کو سونے سے پہلے کیا کرو۔ وہ ہے ”محاسبہ“ اپنے نفس سے کہو کہ تم نے صبح یہ معاہدہ کیا تھا کہ کوئی گناہ کا کام نہیں کروں گا، اور ہر کام شریعت کے مطابق کروں گا، تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کروں گا۔ اب بتاؤ کہ تم نے کونسا کام اس معاہدے کے مطابق کیا، اور کونسا کام اس معاہدے کے خلاف کیا؟ اس طرح اپنے پورے دن کے تمام اعمال کا جائزہ لو۔ صبح جب میں گھر سے باہر نکلا تھا، تو فلاں آدمی سے

کیا بات کہی تھی؟ جب میں ملازمت پر گیا تو وہاں اپنے فرائض میں نے کس طرح ادا کئے؟ تجارت میں نے کس طرح کی؟ حلال طریقے سے کی یا حرام طریقے سے کی؟ اور جتنے لوگوں سے ملاقات کی ان کے حقوق کس طرح ادا کئے؟ بیوی بچوں کے حقوق کس طرح ادا کئے؟ ان سب معاملات کا جائزہ لو، اس کا نام ہے "محاسبہ"

پھر شکر ادا کرو

اس "محاسبہ" کے نتیجے میں اگر یہ بات سامنے آئے کہ تم نے صبح جو معاہدہ کیا تھا، اس میں کامیاب ہو گئے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے اس معاہدے پر قائم رہنے کی توفیق دی، اللھم لک الحمد ولک الشکر۔ اس شکر کا نتیجہ وہ ہو گا جس کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ:

﴿لئن شکرتم لا زیدنکم﴾

اگر تم نعمت پر شکر ادا کرو گے تو اللہ تعالیٰ وہ نعمت اور زیادہ دیں گے، لہٰذا جب تم نے اس معاہدے پر قائم رہنے کی نعمت پر شکر ادا کیا تو آئندہ اس نعمت میں اور اضافہ ہو گا۔ اور اس پر ثواب ملے گا۔

ورنہ توبہ کرو

اور اگر اس "محاسبہ" کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئے کہ فلاں موقع پر اس معاہدے کی خلاف ورزی ہو گئی، فلاں موقع پر میں بھٹک گیا اور پھسل گیا اور اپنے اس عہد پر قائم نہ رہ سکا، تو اس وقت فوراً توبہ کرو۔ اور یہ کہو کہ یا اللہ! میں نے یہ معاہدہ تو کیا تھا، لیکن نفس و شیطان کے جال میں آکر میں اس معاہدے پر قائم نہیں رہ سکا، یا اللہ! میں آپ سے معافی مانگتا ہوں، اور توبہ کرتا ہوں، آپ مجھے معاف فرما دیجئے۔

اپنے نفس پر سزا جاری کرو

توبہ کرنے کے ساتھ اپنے نفس کو کچھ سزا بھی دو، اور اپنے نفس سے کہو کہ تم نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے، لہٰذا تمہیں اب آٹھ رکعت نفل پڑھنی ہوں گی۔ یہ سزا صبح کو معاہدہ کرتے وقت ہی تجویز کرلو۔ لہٰذا رات کو اپنے نفس سے کہو کہ تم نے اپنی راحت اور آرام کی خاطر اور تھوڑی سی لذت حاصل کرنے کی خاطر مجھے عہد شکنی کے اندر مبتلا کیا، اس لئے اب تمہیں تھوڑی سزا ملنی چاہئے، لہٰذا تمہاری سزا یہ ہے کہ اب سونے سے پہلے آٹھ رکعت نفل ادا کرو۔ اس کے بعد سونے کے لئے بستر پر جاؤ۔ اس سے پہلے سونا بند۔

سزا مناسب اور معتدل ہو

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسی سزا مقرر کرو جس میں نفس پر تھوڑی مشقت بھی ہو، نہ بہت زیادہ ہو کہ نفس بدک جائے، اور نہ اتنی کم ہو کہ نفس کو اس سے مشقت ہی نہ ہو، جیسے ہندوستان میں جب سرسید مرحوم نے علی گڑھ کالج قائم کیا، اس وقت طلبہ پر یہ لازم کردیا تھا کہ تمام طلبہ پنج وقتہ نمازیں مسجد میں باجماعت ادا کریں گے، اور جو طالب علم نماز سے غیر حاضر ہوگا اس کو جرمانہ ادا کرنا پڑے گا، اور ایک نماز کا جرمانہ شاید ایک آنہ مقرر کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو طلبہ صاحب ثروت تھے، وہ پورے مہینے کی تمام نمازوں کا جرمانہ اکٹھا پہلے ہی جمع کرادیا کرتے تھے کہ یہ جرمانہ ہم سے وصول کرلو، اور نماز کی چھٹی۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اِتنا کم اور معمولی جرمانہ بھی نہ ہو کہ آدمی اِکٹھا جمع کرادے، اور نہ اِتنا زیادہ ہو کہ آدمی بھاگ جائے، بلکہ درمیانہ اور معتدل جرمانہ مقرر کرنا چاہئے۔ مثلاً آٹھ رکعت نفل پڑھنے کی سزا مقرر کرنا ایک مناسب سزا ہے۔

کچھ ہمت کرنی پڑے گی

بہرحال، اگر نفس کی اصلاح کرنی ہے تو تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں ہلانے پڑیں گے، کچھ نہ کچھ مشقت برداشت کرنی پڑے گی، کچھ نہ کچھ ہمت تو کرنی ہوگی، اور اس کے لئے عزم اور ارادہ کرنا ہوگا، ویسے ہی بیٹھے بیٹھے تو نفس کی اصلاح نہیں ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ طے کرلو کہ جب کبھی نفس غلط راستے پر جائے گا تو اس وقت آٹھ رکعت نفل ضرور پڑھوں گا۔ جب نفس کو پتہ چلے گا کہ یہ آٹھ رکعت پڑھنے کی ایک نئی مصیبت کھڑی ہوگئی، تو آئندہ کل وہ نفس تمہیں گناہ سے بچانے کی کوشش کرے گا، تاکہ اس آٹھ رکعت نفل سے جان چھوٹ جائے۔ اس طرح وہ نفس آہستہ آہستہ انشاء اللہ سیدھے راستے پر آجائے گا، اور پھر تمہیں نہیں بہکائے گا۔

یہ چار کام کرلو

اِمام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی نصیحت کا خلاصہ یہ ہے کہ چار کام کرلو:

① صبح کے وقت مشارطہ یعنی معاہدہ۔
② ہر عمل کے وقت مراقبہ۔
③ رات کو سونے سے پہلے محاسبہ۔
④ اگر نفس بہک جائے تو سونے سے پہلے معاقبہ یعنی اِس کو سزا دینا۔

یہ عمل مسلسل کرنا ہوگا

ایک بات اور یاد رکھنی چاہئے کہ دو چار روز یہ عمل کرنے کے بعد یہ مت سمجھ لینا کہ بس اب ہم پہنچ گئے اور بزرگ بن گئے، بلکہ یہ عمل تو مسلسل کرنا ہوگا۔ اور اس میں یہ ہوگا کہ کسی دن تم غالب آجاؤ گے اور کسی دن شیطان غالب آجائے گا، لیکن ایسا نہ ہو کہ اس کے غالب آنے سے تم گھبرا جاؤ اور یہ عمل چھوڑ بیٹھو، اس لئے کہ اس میں

بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت ہے۔ انشاء اللہ اس طرح گرتے پڑتے ایک دن منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔ اور اگر یہ عمل کرنے کے بعد پہلے دن ہی منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دماغ میں یہ خنّاس سوار ہو جائے گا کہ میں تو جنید اور شبلی بن گیا۔ اس لئے کبھی اس عمل کے ذریعہ کامیابی ہو گی اور کبھی ناکامی ہو گی، جس دن کامیابی ہو جائے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرو، اور جس دن ناکامی ہو جائے اس دن توبہ واستغفار کرو، اور اپنے نفس پر سزا جاری کرو، اور اپنے بُرے فعل پر ندامت اور شکستگی کا اظہار کرو۔ یہ ندامت اور شکستگی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قِصّہ لکھا ہے کہ آپ روزانہ تہجد کی نماز کے لئے بیدار ہوا کرتے تھے۔ ایک دن آپ کی آنکھ لگ گئی اور تہجد قضا ہو گئی۔ سارا دن روتے روتے گزار دیا اور توبہ واستغفار کی کہ یا اللہ! آج میری تہجد کا ناغہ ہو گیا۔ اگلی رات جب سوئے تو تہجد کے وقت ایک شخص آیا اور آپ کو تہجد کے لئے بیدار کیا، آپ نے بیدار ہو کر دیکھا کہ یہ بیدار کرنے والا شخص کوئی اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں ابلیس ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تو ابلیس ہے تو تہجد کی نماز کے لئے اٹھانے سے تجھے کیا غرض؟ وہ شیطان کہنے لگا: بس آپ اٹھ جائیے، اور تہجد پڑھ لیجئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم تو تہجد سے روکنے والے ہو، تم اٹھانے والے کیسے بن گئے؟ شیطان نے جواب دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ گذشتہ رات میں نے آپ کو تہجد کے وقت سلا دیا اور آپ کی تہجد کا ناغہ کرا دیا، لیکن سارا دن آپ تہجد چھوٹنے پر روتے رہے، اور استغفار کرتے رہے، جس کے نتیجے میں آپ کا درجہ اتنا بلند ہو گیا کہ تہجد پڑھنے سے بھی اتنا بلند نہ ہوتا۔ اس سے اچھا تو یہ تھا کہ آپ تہجد ہی پڑھ لیتے۔ اس لئے آج میں خود آپ کو تہجد کے لئے اٹھانے آیا ہوں تاکہ آپ کا درجہ مزید بلند نہ ہو جائے۔

ندامت اور توبہ کے ذریعہ درجات کی بلندی

بہرحال، اگر انسان کو اپنی گذشتہ غلطی پر صدق دل سے ندامت ہو۔ اور آئندہ اس کی طرف نہ لوٹنے کا عزم ہو تو اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اس بندے کے درجات بلند فرما کر اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی بندہ غلطی کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے، ا ر معافی مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بندے سے فرماتے ہیں کہ تجھ سے جو یہ غلطی ہوئی، اس غلطی نے تمہیں ہماری ستّاری، ہماری غفّاری اور ہماری رحمت کا مورد بنا دیا، اور یہ غلطی بھی تمہارے حق میں فائدہ مند بن گئی۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب عید الفطر کا دن آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی عزّت اور جلال کی قسم کھاکر فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ آج یہ لوگ یہاں جمع ہو کر فریضہ ادا کر رہے ہیں اور مجھے پکار رہے ہیں۔ مجھ سے مغفرت طلب کر رہے ہیں اور اپنے مقاصد مانگ رہے ہیں۔ میری عزّت اور میرے جلال کی قسم، میں ضرور آج ان کی دعائیں قبول کروں گا۔ اور ان کی بُرائیوں اور گناہوں کو بھی حسنات اور نیکیوں میں تبدیل کردوں گا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ گناہ اور یہ بُرائیاں کس طرح نیکیوں میں تبدیل ہوجائیں گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب کسی انسان سے غفلت اور نادانی سے ایک گناہ سرزد ہوگیا، اور اس کے بعد وہ ندامت اور افسوس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے کہ یا اللہ! غفلت اور نادانی سے یہ گناہ ہوگیا، معاف فرمادیجئے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی ندامت کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ گناہ معاف فرمادیتے ہیں، بلکہ اس کی بدولت اس کے درجات بھی بلند فرمادیتے ہیں۔ اور اس طرح وہ گناہ بھی درجات کی بلندی کا سبب بن جاتا ہے، اور اس کے حق میں خیر بن جاتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿فاولئک یبدل اللہ سیاٰتھم حسنٰت﴾ (الفرقان: ۷۰)

یعنی اللہ تعالیٰ ان کی سیئات کو حسنات میں تبدیل فرمادیتے ہیں۔

ایسی تیسی مرے گناہوں کی

ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجازِ صحبت تھے، بہت اونچے مقام کے بزرگ تھے۔ وہ شعر بھی کہا کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر مجھے بہت پسند ہے، اور بار بار یاد آتا ہے، وہ یہ کہ ؎

دولتیں مل گئیں ہیں آہوں کی
ایسی تیسی مرے گناہوں کی

یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں گناہوں پر ندامت اور عجز و نیاز اور آہ و بکا عطا فرمادی، اور ہم دعا بھی کررہے ہیں کہ یا اللہ! میرے اس گناہ کو معاف فرمادیجئے، مجھ سے غلطی ہوگئی۔ تو اب گناہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ گناہ بھی اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز حکمت سے خالی پیدا نہیں کی۔ لہٰذا گناہ کے پیدا کرنے میں بھی حکمت اور مصلحت ہے، وہ یہ کہ گناہ ہوجانے کے بعد جب توبہ کروگے، اور ندامت کے ساتھ آہ و بکا کروگے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کروگے تو اس توبہ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہیں کہاں سے کہاں پہنچادیں گے۔

نفس سے زندگی بھر کی لڑائی ہے

لہٰذا رات کو جب پورے دن کے اعمال کا محاسبہ کرتے وقت پتہ چلے کہ آج گناہ سرزد ہوگئے ہیں تو اب توبہ واستغفار کرو، اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور مایوس مت ہو جاؤ۔ اس لئے کہ یہ زندگی ایک جہاد اور لڑائی ہے، جس میں مرتے دم تک نفس اور شیطان سے لڑائی اور مقابلہ کرنا ہے، اور مقابلے کے اندر یہ تو ہوتا ہے کہ کبھی تم نے گرا دیا، کبھی دوسرے نے گرا دیا، لہٰذا اگر شیطان تمہیں گرادے تو اس وقت ہمت ہار کر پڑے مت رہنا، بلکہ دوبارہ نئے عزم اور ولولے کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ،

اور پھر شیطان کے مقابلے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اور یہ تمہارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر تم ہمت نہیں ہارو گے، بلکہ دوبارہ مقابلے کے لئے کھڑے ہو جاؤ گے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ مدد مانگتے رہو گے تو انشاء اللہ بالآخر فتح تمہاری ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

﴿والعاقبة للمتقين﴾ (القصص: ۸۳)

انجام متقیوں کے ہاتھ میں ہے، فتح تمہاری ہو گی۔

تم قدم بڑھاؤ، اللہ تعالیٰ تھام لیں گے

ایک اور جگہ پر ارشاد فرمایا:

﴿والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا﴾ (العنکبوت: ۶۹)

جن لوگوں نے ہمارے راستہ میں جہاد کیا۔ یعنی نفس و شیطان کے ساتھ تم نے اس طرح لڑائی کی کہ وہ شیطان تمہیں غلط راستے پر لے جارہا ہے، اور تم اس سے مقابلہ کر رہے ہو، اور کوشش کر کے غلط راستے سے بچ رہے ہو تو پھر ہمارا وعدہ ہے کہ ہم ضرور بالضرور مقابلہ کرنے اور کوشش کرنے والوں کو اپنے راستے کی ہدایت دیں گے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں اس آیت کا ترجمہ یہ کرتا ہوں کہ جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں تو ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے چلتے ہیں۔

پھر ایک مثال کے ذریعہ اِس آیت کو سمجھاتے ہوئے فرماتے کہ جب بچہ چلنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اس وقت ماں باپ کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ بچہ چلے، چنانچہ اس کو چلنا سکھاتے ہیں اور اس کو تھوڑی دور کھڑا کر دیتے ہیں، اور پھر اس بچے کو اپنے پاس بلاتے ہیں کہ بیٹا ہمارے پاس آؤ۔ اگر بچہ وہیں کھڑا رہے اور قدم آگے نہ بڑھائے تو ماں باپ بھی دور کھڑے رہیں گے، اور اس کو گود میں نہیں اٹھائیں گے۔ لیکن اگر بچے نے

ایک قدم بڑھایا، اور دوسرے قدم پر وہ گرنے لگا تو اب ماں باپ اس کو گرنے نہیں دیتے، بلکہ آگے بڑھ کر اس کو تھام لیتے ہیں اور گود میں اٹھا لیتے ہیں۔ اس لئے کہ بچے نے قدم بڑھاکر اپنی سی کوشش کرلی۔ اسی طرح جب انسان اللہ تعالیٰ کے راستے میں چلتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اس کو بے یارومددگار چھوڑ دیں گے، اور اس کو نہیں تھامیں گے؟ ایسا نہیں کریں گے۔ بلکہ اس آیت میں وعدہ ہے کہ جب تم چلنے کی کوشش کروگے تو ہم آگے بڑھ کر تمہیں گود میں اٹھا کر لے جائیں گے۔ اس لئے آگے قدم بڑھاؤ، ہمّت کرو، کوشش کرو، مایوس ہو کر مت بیٹھ جاؤ ؎

سوئے مایوسی مرو امید ھا است
سوئے تاریکی مرو خورشید ھا است

ان کے دربار میں مایوسی اور تاریکی کا گزر نہیں ہے۔ لہٰذا نفس وشیطان سے مقابلہ کرتے رہو، اگر غلطی ہو جائے تو پھر امید کا دامن مت چھوڑو، مایوس مت ہو جاؤ، بلکہ کوشش جاری رکھو، انشاء اللہ تم ایک دن ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تم اپنے حصّے کا کام کرلو، اللہ تعالیٰ اپنے حصّے کا کام ضرور کریں گے۔ یاد رکھو، تمہارے حصّے میں جو کام ہیں اس میں نقص اور کمی ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ کے حصّے کے کام میں نقص اور کمی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جب تم قدم بڑھاؤ گے تو تمہارے لئے راستے کھلیں گے انشاء اللہ۔ اسی کی طرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اشارہ فرمایا کہ:

﴿موتوا قبل ان تموتوا وحاسبوا قبل ان تحاسبوا﴾

یعنی مرنے سے پہلے مرو۔ اور آخرت کے حساب سے پہلے اپنا محاسبہ کرلو،

اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا یہ جواب دوگے؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ محاسبہ کا ایک

طریقہ یہ ہے کہ یہ تصور کرو کہ آج تم میدانِ حشر کے اندر کھڑے ہو۔ اور تمہارا حساب و کتاب ہو رہا ہے۔ نامۂ اعمال پیش ہو رہے ہیں۔ تمہارے نامۂ اعمال کے اندر جو تمہارے بُرے اعمال درج ہیں، وہ سب سامنے آرہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تم سے سوال کررہے ہیں کہ تم نے یہ بُرے اعمال اور گناہ کیوں کئے تھے؟ کیا اس وقت تم اللہ تعالیٰ کو وہی جواب دو گے جو آج تم مولویوں کو دیتے ہو؟ آج جب تم سے کوئی مولوی یا مصلح یہ کہتا ہے کہ فلاں کام مت کرو، نگاہ کی حفاظت کرو، سود سے بچو، غیبت اور جھوٹ سے بچو، ٹی وی کے اندر جو فحاشی اور عریانی کے پروگرام آرہے ہیں، اِن کو مت دیکھو، شادی بیاہ کی تقریبات میں بے پردگی سے بچو۔ تو اِن باتوں کے جواب میں تم مولوی صاحب کو یہ جواب دیتے ہو کہ ہم کیا کریں۔ زمانہ ہی ایسا خراب ہے، ساری دنیا ترقی کر رہی ہے، چاند پر پہنچ گئی ہے، کیا ہم ان سے پیچھے رہ جائیں، اور دنیا سے کٹ کر بیٹھ جائیں۔ اور آج کے اس معاشرے میں یہ سب کام کئے بغیر آدمی کا گزارہ نہیں ہے۔ یہ وہ جواب ہے جو آج تم مولویوں کے سامنے دیتے ہو، کیا اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی یہی جواب دو گے؟ کیا یہ جواب وہاں اللہ تعالیٰ کے سامنے کافی ہو گا؟ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کہ سوچ کر بتاؤ۔ اگر یہ جواب وہاں نہیں چلے گا تو پھر آج دنیا میں بھی یہ جواب کافی نہیں ہو سکتا۔

ہمت اور حوصلہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو

اور اگر تم اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ جواب دو گے کہ یا اللہ! ماحول اور معاشرے کی وجہ سے میں گناہ کرنے پر مجبور تھا۔ تو اللہ تعالیٰ یہ سوال کریں گے کہ اچھا یہ بتاؤ کہ تم مجبور تھے یا میں مجبور تھا؟ تم یہ جواب دو گے کہ یا اللہ! میں ہی مجبور تھا۔ آپ مجبور نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب میں مجبور نہیں تھا تو تم نے مجھ سے اپنی اس مجبوری کو دور کرنے کی دعا کیوں نہیں کی؟ اور کیا میں تمہاری اس مجبوری کو دور کرنے پر قادر نہیں تھا؟ اگر میں قادر تھا تو مجھ سے مانگتے، اور یہ کہتے کہ یا اللہ! یہ مجبوری پیش آگئی ہے، یا تو آپ اس مجبوری کو دور فرما دیجئے، یا پھر مؤاخذہ مت فرمایئے گا، اور مجھے اس پر سزا مت

دیجئے گا۔ بتایئے! کیا تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کے اس سوال کا جواب ہے؟ اگر جواب نہیں ہے تو پھر آج زندگی کے اندر یہ کام کرلو۔ وہ یہ کہ جن کاموں کے کرنے پر تم اپنے آپ کو مجبور پارہے ہو، خواہ واقعۃً مجبور ہو، یا معاشرے کی وجہ سے مجبور ہو، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے روزانہ دعا کرلو کہ یا اللہ! یہ مجبوری پیش آگئی ہے، اس کی وجہ سے میرے اندر اس سے بچنے کی ہمت نہیں ہورہی ہے، آپ قادر مطلق ہیں، اِس مجبوری کو بھی دور کرسکتے ہیں، اور اس بے ہمتی کو بھی دور کرسکتے ہیں۔ اس مجبوری کو دور کردیجئے، اور اس گناہ سے بچنے کی ہِمت اور حوصلہ عطا فرمادیجئے۔

ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

بہرحال، اللہ تعالیٰ سے مانگو، یہ تجربہ ہے کہ جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور عطا فرمادیتے ہیں۔ اگر کوئی مانگے ہی نہیں تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

کوئی حسن شناس اَدا نہ ہو تو کیا علاج
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

لہٰذا مانگنے والا ہی نہ ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ ان کا دامن رحمت کھلا ہے۔ بہرحال، آج ہم نے صبح وشام چار کام کرنے کا جو نسخہ پڑھا ہے اگر ہم اس پر کاربند ہوجائیں تو انشاء اللہ اس حدیث پر عمل کرنے والے بن جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی مغفرت فرمائے اور ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

غیر ضروری سوالات سے پرہیز کریں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غیر ضروری سوالات سے

پرہیز کریں

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئآت اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ واشھد ان لاإلہ إلا اللّٰہ وحدہ لاشریك لہ، واشھد ان سیدنا ونبینا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ، صلی اللّٰہ تعالی علیہ وعلی آلہ وأصحابہ وبارك وسلّم تسلیمًا کثیرًا کثیرًا۔

اما بعد :-

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال : دعونی ماترکتم أنما أھلك من کان قبلکم کثرۃ سؤلھم واختلافھم علی انبیاء ھم، فاذا نھیتُکم عن شیٔ فاجتنبوہ، وإذا امرتکم بأمر فأتوا منہ مااستطعتم۔

کثرت سوال کا نتیجہ۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ : جب تک کسی خاص مسئلے کے بارے میں کوئی خاص بات نہ بتاؤں، اس وقت تک تم مجھے چھوڑے رکھو اور مجھ سے سوال نہ کرو، یعنی جس کام کے بارے میں میں نے یہ نہیں کہا کہ یہ کرنا فرض ہے یا یہ کام کرنا حرام اور ناجائز ہے، اس کام کے بارے میں بلاوجہ اور بلا ضرورت سوال کرنے کی ضرورت نہیں، اسلئے کہ تم سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی جو امتیں ہلاک ہوئیں، ان کی ہلاکت کا ایک سبب ان کا کثرت سے سوال کرنا بھی تھا، اور دوسرا سبب اپنے انبیاء کے بتائے ہوئے احکام کی خلاف ورزی تھی، لہٰذا جب میں تم کو کسی چیز سے روکوں تو تم اس سے رک جاؤ۔ اس میں قیل و قال اور چوں و چرا نہ کرو، اور جس چیز کا میں تم کو حکم دوں تو اسکو اپنی استطاعت کے مطابق بجا لاؤ۔۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم پر شفقت دیکھئے کہ استطاعت کی قید لگا دی کہ اپنی استطاعت کے مطابق بجا لاؤ، گویا استطاعت سے زیادہ کا ہمیں مکلف نہیں بنایا۔

کس قسم کے سوالات سے پرہیز کیا جائے۔

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کی کثرت کی مذمت بیان فرمائی ہے، لیکن بعض دوسری احادیث میں سوال کرنے کی فضیلت بھی آئی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : "انما شفاء العی السؤال" یعنی پیاسے کی تشفی سوال سے ہوتی ہے۔ دونوں قسم کی احادیث اپنی اپنی جگہ درست ہیں، دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ جس معاملے میں خود انسان کو حکم شرعی معلوم

کرنے کی ضرورت پیش آئے کہ یہ معاملہ جو میں کر رہا ہوں، شرعاً جائز ہے یا نہیں، ایسے موقع پر سوال نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ ضروری ہے، لیکن اگر سوالات کرنے کا منشاء یا تو محض وقت گزاری ہے یا اس سوال کا اسکی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسلئے کہ وہ مسئلہ اس کو پیش نہیں آیا یا وہ ایسا مسئلہ ہے جسکی دین میں کوئی اہمیت نہیں اور عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ قبر میں اسکے بارے میں سوال ہو گا اور نہ آخرت میں سوال ہو گا اور اس کے معلوم نہ ہونے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے، تو ایسے مسائل کے بارے میں سوال کرنے کی اس حدیث میں ممانعت آئی ہے۔

فضول سوالات میں لگانا شیطان کا کام ہے۔

مثلاً ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جو دو بیٹے تھے، ھابیل اور قابیل، ان دونوں کے درمیان لڑائی ہوئی، جس کے نتیجے میں قابیل نے ھابیل کو قتل کر دیا، اس لڑائی کا سبب ایک لڑکی تھی، اس لڑکی کا نام کیا تھا؟ اب بتایئے کہ اگر اس لڑکی کا نام معلوم ہو جائے تو اس سے کیا فائدہ ہو گا؟ اور اگر معلوم نہ ہو تو اس سے نقصان کیا ہو گا؟ کیا قبر میں منکر نکیر پوچھیں گے کہ اس لڑکی کا نام بتاؤ ورنہ تمہیں جنت نہیں ملے گی، یا میدان حشر میں اللہ تعالیٰ اسکے نام کے بارے میں تم سے سوال کریں گے۔ لہٰذا اس قسم کے مسائل جن کا قبر میں، حشر میں، آخرت میں بھی واسطہ پیش نہیں آئیگا ان کے بارے میں سوال کرنا درست نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان کو صحیح راستے سے ھٹانے کے لئے شیطان کے پاس مختلف حربے ہیں، ان میں سے ایک حربہ یہ ہے کہ وہ

شیطان انسان کو ایسے کام میں لگا دیتا ہے جس کا کوئی حاصل نہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عملی کاموں سے انسان غافل ہو جاتا ہے اور ان فضول سوالات کے چکر میں لگ جاتا ہے۔

حکم شرعی کی علت کے بارے میں سوال۔

اسی طرح آج کل لوگوں میں یہ مرض بہت عام ہے کہ جب کسی عمل کے بارے میں بتاؤ کہ شریعت میں یہ حکم موجود ہے کہ یہ کام کرو، یا یہ حکم ہے کہ فلاں کام مت کرو، تو لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ فلاں چیز کو جو حرام قرار دیا گیا ہے، یہ حرمت کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اسکی کیا وجہ ہے؟ اور سوال کرنے والے کا انداز یہ بتاتا ہے کہ اگر ہمارے اس سوال کا معقول جواب ہمیں مل گیا اور ہماری عقل نے اس جواب کو صحیح تسلیم کرلیا تب تو ہم اس حکم شرعی کو مانیں گے ورنہ نہیں مانیں گے --- حالانکہ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف فرما دیا کہ جب میں نے تم کو کسی چیز سے روک دیا تو تمہارا کام یہ ہے کہ رک جاؤ اور اس تحقیق میں پڑنا تمہارا کام نہیں کہ اس روکنے میں کیا حکمت ہے؟ کیا مصلحت اور کیا فائدہ ہے؟

علت کے بارے میں سوال کا بہترین جواب۔

ایک صاحب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کے پاس آئے اور کسی شرعی مسئلے کے بارے میں پوچھنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز کو کیوں حرام کر دیا؟ اسکی کیا وجہ ہے؟ کیا حکمت اور مصلحت ہے؟ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک بات کا آپ جواب دیدیں تو میں اس کا جواب آپ کو دیدونگا، انہوں نے کہا کہ وہ

کیا بات ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ آپ کی ناک سامنے کیوں لگی ہے، پیچھے کیوں نہیں لگی؟ مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور مصلحت سے اس کارخانہ عالم کا نظام چلا رہے ہیں، تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارا یہ چھوٹا سا دماغ جو تمہارے سر میں ہے، اسکی ساری حکمتوں اور مصلحتوں کا احاطہ کر لے، حالانکہ آج کے دور میں سائنس اتنی ترقی کے باوجود اس چھوٹے سے دماغ کی بھی پوری تحقیق نہیں کر سکی اور یہ کہتی ہے کہ اس دماغ کا اکثر حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں اب تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس کا عمل کیا ہے؟ ایسے دماغ کے ذریعہ تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ساری حکمتوں کا احاطہ کر لو کہ فلاں چیز کو کیوں حرام کیا؟ اور فلاں چیز کو کیوں حلال کیا؟ بات یہ کہ اپنی حقیقت سے ناواقفیت اور دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کی کمی کے نتیجے میں اس قسم کے سوال ذہن میں آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں میں دخل مت دو۔

اب مثلاً کوئی شخص یہ سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے فجر کی نماز میں دو رکعت فرض فرمائی ہیں، ظہر کی نماز میں چار، عصر کی نماز میں چار، مغرب کی نماز میں تین رکعت فرض فرمائی ہیں، اس فرق کرنے میں کیا حکمت ہے؟ اور کیا وجہ ہے؟ اب اگر کوئی شخص اپنے سے سوچ کر یہ کہے کہ فجر کی نماز کا وقت چونکہ فرصت کا ہوتا ہے تو اس وقت چار رکعت فرض ہونی چاہئیں اور چونکہ عصر کا وقت مشغولیت کا ہوتا ہے تو اس وقت دو رکعت فرض ہونی چاہئیں۔ ارے تم اپنی چھوٹی سی عقل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں کے اندر دخل دینا چاہتے ہو؟ اور یہ فیصلہ کرتے ہو کہ فلاں وقت اتنی رکعت فرض ہونی چاہئیں۔ لہٰذا شریعت کے کسی بھی حکم کے

بارے میں یہ سوال کرنا کہ یہ حکم کیوں دیا گیا' یہ غلط سوال ہے۔ ایسے سوال سے آپ نے منع فرمایا۔

صحابہ کرامؓ "کیوں" سے سوال نہیں کیا کرتے تھے۔

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے حالات پڑھ کر دیکھئے تو آپ کو پورے ذخیرہ حدیث میں یہ کہیں نظر نہیں آئیگا کہ کسی صحابی نے کسی حکم شرعی کے بارے میں یہ سوال کیا ہو کہ یہ حکم کیوں دیا گیا؟ ایک مثال نہیں ملے گی۔ البتہ یہ سوال ملے گا کہ فلاں چیز کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟ لفظ "کیوں" سے سوال نہیں کرتے تھے۔ سوال نہ کرنے کی وجہ کیا تھی؟ کیا ان کے اندر عقل اور سمجھ نہیں تھی؟ کیا وہ ان شرعی حکموں کی حکمتیں اور مصلحتیں نہیں پہچان سکتے تھے؟ ایسا نہیں تھا' کیونکہ ان کی عقل اتنی تھی کہ آج کے دور کا بڑے سے بڑا عقل مند ان کی عقل کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا' پھر سوال نہ کرنے کی کیا وجہ تھی؟ وجہ یہ تھی کہ اس عقل ہی کا تقاضہ یہ تھا کہ جب اللہ کو اپنا خالق اور مالک مان لیا اور نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا رسول مان لیا تو اب جو بات اور جو حکم بھی ان کی طرف سے آئے گا وہ حق ہو گا' اس میں ہمارے لئے چوں و چرا کی مجال اور گنجائش نہیں --- اس لئے لفظ "کیوں" سے صحابہ کرامؓ سوال نہیں کرتے تھے۔

یہ اللہ کی محبت اور عظمت کی کمی کی دلیل ہے۔

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ شریعت کے احکام کے سلسلے میں جن لوگوں کے دلوں میں بہت زیادہ شکوک و شبہات ہوتے ہیں اسکی اصل وجہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت کی کمی ہے۔ اس لئے کہ جس ذات کی عظمت اور محبت

دل میں ہوگی اسکی طرف سے دیئے گئے حکم میں شکوک و شبہات پیدا نہیں ہونگے دنیا کے اندر دیکھ لیں کہ جس سے محبت اور عقیدت ہوتی ہے' وہ اگر کسی بات کا حکم دے تو چاہے وہ حکم ہماری سمجھ میں نہ آرہا ہو' لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص اتنا بڑا آدمی ہے کہ اس کے حکم کے پیچھے کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوگی۔ تو وہ ذات جس کی قدرت' جس کا علم اور جس کی رحمت ساری کائنات کو محیط ہے' وہ ذات اگر یہ حکم دے کہ یہ عمل کرو اور یہ عمل مت کرو تو اسکی عظمت اور محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی یہ نہ سوچے کہ مجھے یہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے؟ اور اس حکم میں کیا فائدہ اور کیا مصلحت ہے؟ دین نام ہی اس کا ہے کہ اپنے آپ کو ان کے حوالے کردو اور چوں و چرا کو درمیان سے نکال دو۔ آج کی گمراہیوں کا سب سے بڑا سرچشمہ اور بنیادی سبب یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے احکام کو اپنی عقل سے پرکھنے کی کوشش کی جارہی ہے' اور اگر کسی حکم کی حکمت عقل میں نہیں آرہی تو اس کو شریعت کا حکم ماننے سے انکار کیا جارہا ہے۔

بچے اور نوکر کی مثال۔

چھوٹا بچہ جو ابھی بالکل نادان ہے' باپ اس کو کسی کام کا حکم دیتا ہے یا ماں اسکو حکم دیتی ہے' اگر وہ بچہ یہ کہے کہ مجھے یہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے؟ جب تک آپ مجھے اس کام کی حکمت نہیں سمجھائیں گے اس وقت تک میں یہ کام نہیں کرونگا تو ایسا بچہ کبھی صحیح تربیت نہیں پا سکے گا--- بچے کو چھوڑیے' ایک آدمی جو عاقل بالغ ہے اور اسکو آپ نے اپنا نوکر رکھا ہوا ہے' آپ نے اس سے کہا کہ بازار جا کر فلاں سودا لے آؤ' وہ نوکر پلٹ کر یہ پوچھتا ہے کہ پہلے آپ مجھے اس کی حکمت اور وجہ بتائیے کہ

آپ یہ چیز بازار سے کیوں منگوا رہے ہیں؟ پہلے آپ حکمت بتایئے پھر میں بازار سے یہ چیز لاؤنگا۔ ایسا نوکر کان سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دینے کے لائق ہے۔ اسلئے ۔ نوکر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ پوچھے کہ آپ یہ چیز کیوں منگوا رہے ہیں؟ وہ نوکر ہے اور نوکر کا کام یہ ہے کہ جو حکم بھی اس کو دیا جا رہا ہے وہ اسکو بجا لائے' وہ یہ نہ پوچھے کہ یہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے؟ جب نوکروں کے ساتھ تمہارا یہ معاملہ ہے' حالانکہ نوکر بھی انسان ہے اور تم بھی انسان ہو' تو اللہ تو خالق اور معبود ہیں اور تم اسکے بندے ہو' نوکر اور آقا میں تو پھر بھی مناسبت ہے' اس لئے کہ دونوں کی عقل محدود ہے' لیکن بندے اور اللہ میں تو کوئی مناسبت ہی نہیں' اسلئے کہ تمہاری عقل محدود اور اللہ جل شانہ کی حکمتیں لامحدود' اسلئے اللہ کے حکم کی حکمت کے بارے میں سوال کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

بہرحال: اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے تین قسم کے سوالات سے منع فرمایا ہے' ایک بے فائدہ سوال کرنا جس کا عملی زندگی سے تعلق نہ ہو' دوسرے ایسے معاملے یا ایسی صورت حال کے بارے میں سوال کرنا جو اپنی ذات کو ابھی پیش نہ آیا ہو' تیسرے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم کی حکمت معلوم کرنے کے لئے سوال کرنا۔ اور مقصد سوال کرنے کا یہ ہو کہ اگر اس حکم کی حکمت معلوم ہو گی تو عمل کرونگا ورنہ نہیں کرونگا۔ اور فرمایا کہ پچھلی امتیں ان تین چیزوں کے بارے میں سوالات کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئیں' تم ان چیزوں کے بارے میں سوال کرنے سے پرہیز کرو' اور جب میں تم کو کسی چیز سے روک دوں تو تم رک جاؤ' اسکی حکمت تلاش کرنے کے پیچھے مت پڑو۔ اللہ تعالٰی ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

﴿وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین﴾

معاملات جدیدہ
اور علماء کی ذمہ داریاں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

عرض ناشر

جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ مطابق اکتوبر ۱۹۹۳ء میں دارالعلوم کراچی میں "الدورة التعلیمیة حول الاقتصاد المعاصر فی ضوء الشریعة الاسلامیة" کے عنوان سے معاملات جدیدہ اور ان کی فقہی حیثیت سے متعلق پندرہ روزہ تعلیمی کورس منعقد کیا گیا تھا، جس میں ملک کے مختلف حصوں سے علماء نے شرکت فرمائی تھی۔ اس دوران حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے علماء کو عصر حاضر کے معاشی مسائل سے متعلق ضروری معلومات پر مشتمل یومیہ تقریباً تین گھنٹے درس دیا، یہ دورہ برصغیر پاک وہند میں اپنی نوعیت کا پہلا دورہ تھا ـــــ زیر نظر مضمون حضرت مولانا کا افتتاحی خطاب ہے جس میں اس کورس کے پس منظر پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

مولانا سفیر احمد عباسی صاحب نے قارئین کے لئے ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے ضبط کیا ہے۔ اور اب ہم اس کو البلاغ کے شکریہ کے ساتھ شائع کررہے ہیں اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے آمین۔

ولی اللہ میمن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معاملاتِ جدیدہ
اور
علماء کی ذمہ داریاں

الحمدلله نحمده ونستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيات اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادی له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له ونشهدان سيدنا وسندنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى اله واصحابه وبارك وسلم تسليما كثيرا۔

اما بعد!

حضرات علمائے کرام! میں آپ حضرات کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہماری دعوت کو قبول فرمایا، طویل سفر کی زحمت گوارہ کی اور اس دورہ تعلیمیہ کے لئے تشریف لائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس محنت کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائے۔ آمین

اس دورہ تعلیمیہ کی ضرورت

آج ہم اس دورہ تعلیمیہ کا آغاز کررہے ہیں اور آج کی اس محفل میں میں مختصراً یہ عرض کردینا چاہتا ہوں کہ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اس کی اہمیت کیا ہے؟

یہ بات ہر مسلمان کو محسوس ہو رہی ہے اور خاص طور سے اہل علم کو اس کا احساس ہے کہ جب سے مغربی استعمار کا دنیا پر غلبہ ہوا، اس وقت سے دین کو ایک منظم سازش کے تحت صرف عبادت گاہوں، تعلیم گاہوں اور ذاتی گھروں تک محدود کردیا گیا ہے، سیاسی اور معاشی سطح پر دین کی گرفت نہ صرف یہ کہ ڈھیلی پڑگئی بلکہ رفتہ رفتہ ختم ہو چکی ہے۔ یہ اصلاً تو دشمنان اسلام کی بہت بڑی سازش تھی جس کے تحت مذہب کا وہ تصور اجاگر کیا گیا جو مغرب میں ہے۔ مغرب میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ یہ انسان کا ایک ذاتی اور پرائیویٹ معاملہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی مذہب پر کاربند ہو، یا نہ ہو، ایک مذہب اختیار کرے، یا دوسرا مذہب اختیار کرے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ اس وقت تو مغرب میں مذہب کے بارے میں یہ تصور ہے کہ مذہب کا حق وباطل سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ تو درحقیقت انسان کی روحانی تسکین کا ایک ذریعہ ہے۔ روحانی تسکین کے لئے انسان جس مذہب کو بہتر سمجھے، اس کو اختیار کرلے۔ کسی کو بت پرستی میں زیادہ مزہ آتا ہے، اور اسی میں اس کو زیادہ سکون ملتا ہے وہ اس کو اختیار کرلے، اور اگر کسی کو توحید میں زیادہ سکون ملتا ہے تو وہ اس کو اختیار کرلے۔ سوال حق وباطل کا نہیں کہ کون سا مذہب حق ہے اور کون سا باطل ہے، بلکہ سوال یہ ہے کہ کس مذہب میں اس شخص کو زیادہ روحانی سکون محسوس ہوتا ہے، اس لحاظ سے جو شخص بھی جو مذہب اختیار کرلیتا ہے وہ قابل احترام ہے، اور اس میں کسی دوسرے کو دخل اندازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اور یہ چونکہ ذاتی اور پرائیویٹ زندگی کا معاملہ ہے، لہٰذا زندگی کے دوسرے شعبوں میں اس کے عمل دخل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لادینی جمہوریت کا نظریہ

یہیں سے یہ نظریہ وجود میں آیا جس کو آج کی اصطلاح میں سیکولر ازم کہتے ہیں اس نظریہ زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک زندگی کے اجتماعی کام ہیں، مثلاً معیشت اور سیاست وغیرہ یہ ہر مذہب سے آزاد ہیں، اور انسان اپنی عقل،

تجربہ، مشاہدہ کے ذریعہ جس طریقے کو پسند کرلیں وہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے، مذہب کی ان کے اوپر کوئی بالادستی نہیں ہونی چاہئے، اور جہاں تک ذاتی زندگی کا سوال ہے تو جو شخص جس مذہب میں سکون پائے، وہ مذہب اختیار کرلے، کسی دوسرے کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ تمہارا یہ مذہب باطل ہے، ہر شخص اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہے اس وجہ سے نہیں کہ وہ حق ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ اس میں اس کو راحت و سکون میسر آتا ہے ــــــ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مذہب کا تصور آج مغربی نظریات کے تحت یہ ہے کہ "مذہب کی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ لُطف وسُکون کے حصول کا ایک ذریعہ ہے" ــــــ لہٰذا ایک شخص کو اگر اپنے دنیاوی مشاغل سے فرصت کے وقت بندروں کے تماشے کو دیکھ کر ذہنی سکون ملتا ہے تو اس کے لئے بندروں کا تماشہ اچھی چیز ہے، اور جس طرح بندروں کے تماشے کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، اسی طرح اگر کسی کو مسجد میں جاکر نماز پڑھنے میں لُطف آتا ہے اور سُکون ملتا ہے تو اس کے لئے یہی طریقہ مناسب ہے، لیکن اس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ یعنی اس سے بحث نہیں کہ مسجد میں جاکر نماز پڑھنا فی نفسہٖ حق ہے یا باطل؟ (العیاذ باللہ) یہ وہ تصور ہے جو اس وقت پوری مغربی دنیا کے اوپر چھایا ہوا ہے، اور اس کا دوسرا نام "سیکولر ڈیموکریسی" یعنی لادینی جمہوریت ہے۔

آخری نظریہ

اور اب تو یہ کہا جارہا ہے کہ دنیا کے اندر ہر نظام فیل ہوگیا، ہر نظریہ ناکام ہوگیا ہے، اب صرف آخری نظریہ جو کبھی فیل ہونے والا نہیں ہے وہ یہی سیکولر ڈیموکریسی ہے ــــــ جب سوویت یونین کا زوال ہوا تو اس وقت مغرب میں بہت خوشی کے شادیانے بجائے گئے اور باقاعدہ ایک کتاب شائع کی گئی جو ساری دنیا کے اندر بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے، لاکھوں کی تعداد میں اس کے نسخے فروخت ہوچکے ہیں۔ اور اس کو اس دور کی عظیم ترین کتاب کی حیثیت سے متعارف کرایا جارہا

ہے۔ یہ کتاب امریکی وزارت خارجہ کے ایک ترجمان نے ایک تحقیقی مقالے کی شکل میں لکھی ہے جس کا نام ہے:

(The End of the History and the Last Man)

یعنی تاریخ کا خاتمہ اور آخری آدمی ـــــ اس کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ سوویت یونین کے خاتمہ پر ایک تاریخ کا خاتمہ ہوگیا ہے اور آخری انسان جو ہر لحاظ سے مکمل ہے وہ وجود میں آگیا ہے یعنی سیکولر ڈیموکریسی کا نظریہ ثابت ہوگیا ہے اور اب رہتی دنیا تک اس سے بہتر کوئی نظام یا نظریہ وجود میں نہیں آئے گا۔

توپ سے کیا پھیلا؟

جب مغربی استعمار نے اسلامی ملکوں پر اپنا تسلّط جمایا تو اس نے اس لادینی جمہوریت کا تصور بھی پھیلایا، اور بزور شمشیر پھیلایا ـــــ مسلمانوں پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے اسلام تلوار کے زور پر پھیلایا، حالانکہ خود مغرب نے اپنا ڈیموکریسی کا نظام زبردستی اور بزور شمشیر پھیلایا ہے، اسی کی طرف اکبر مرحوم نے اپنے مشہور قطعے میں اشارہ کیا تھا کہ ؎

اپنے عیبوں کی کہاں آپ کو کچھ پروا ہے
غلط الزام بھی اوروں پہ لگا رکھا ہے

یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

توپ و تفنگ کے بل بوتے پر انہوں نے پہلے سیاسی تسلط قائم کیا، اس کے بعد رفتہ رفتہ سیاسی اور معاشی اداروں سے دین کا رابطہ توڑا، اور اس رابطے کو توڑنے کے لئے ایسا تعلیمی نظام وجود میں لائے جو ہندوستان میں لارڈ میکالے نے متعارف کرایا، اور کھلم کھلاّ یہ کہہ کر متعارف کرایا کہ ہم ایک ایسا نظام تعلیم بروئے کار لانا چاہتے ہیں جس سے ایسی نسل پیدا ہو جو رنگ وزبان کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، لیکن

فکر اور مزاج کے اعتبار سے خالص انگریز ہو ـــــ بالآخر وہ اس تعلیمی نظام کو رائج کرنے میں کامیاب ہوگئے جس نے دین کا رشتہ، سیاست، معیشت، اقتصاد اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے کاٹ دیا۔ اور مذہب کو محدود کردیا۔

کچھ دشمن کی سازش اور کچھ اپنی کوتاہی

ایک طرف دشمنان اسلام کی یہ سازش تھی، دوسری طرف اس سازش کے کامیاب ہونے میں کچھ حصّہ ہمارے اپنے طرز عمل کا بھی ہے کہ ہم نے اپنی زندگی میں جتنا زور اور جتنی توجہ عبادات کے اوپر صرف کی، اتنی توجہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرف نہیں دی، حالانکہ اسلام پانچ شعبوں کا نام ہے، عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق۔ عقائد وعبادات کی اہمیت ہماری نظر میں برقرار رہی، لیکن دوسرے شعبوں کو ہم نے اتنی اہمیت نہیں دی جتنی اہمیت دینی چاہئے تھی، اور اہمیت نہ دینے کی دو وجہ ہیں:

(۱) ایک وجہ تو یہ ہے کہ خود ہمارے اپنے عمل کے اندر جتنا اہتمام عقائد وعبادات کی درستگی کا تھا اتنا اہتمام معاملات، معاشرت اور اخلاق کی درستگی کا نہیں تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر ایک شخص (معاذ اللہ) نماز چھوڑ دیتا ہے تو دین داروں کے ماحول ومعاشرے میں وہ بڑا زبردست نکو سمجھا جاتا ہے، اور نکو سمجھا جانا بھی چاہئے، کیونکہ اس نے اللہ کے فریضے کو ادا کرنا چھوڑ دیا، اور دین کے ستون کو گرادیا۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے معاملات میں حرام وحلال کی پرواہ نہیں کرتا، یا جن اخلاق رذیلہ سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے ان سے اجتناب نہیں کرتا تو معاشرے میں اس کو اتنا مطعون اور برا نہیں سمجھا جاتا۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم نے دینی مدارس کی تعلیم میں جتنی اہمیت عبادات کے ابواب کو دی ہے معاملات اور معاشرت اور اخلاق والے حصے کو اتنی اہمیت نہیں دی، فقہ ہو یا حدیث ہو، تحقیق وجستجو کا سارا زور آکر کتاب الحج پر ختم ہوجاتا ہے، بہت چلا تو نکاح اور طلاق تک چل گیا، اس سے آگے بیوع معاملات اور ان

کے متعلقہ مباحث کا ترجمہ بھی نہیں ہوتا، یا اگر ترجمہ بھی ہوگیا تو متعلقہ مباحث کو اس اہتمام سے بیان نہیں کیا جاتا جس اہتمام سے عبادات کے جزوی فروعی مسائل کو بیان کیا جاتا ہے، مثلاً رفع یدین کا مسئلہ اولیٰ وخلافِ اولیٰ ہی کا تو ہے، لیکن اس کے اندر تو تین دن تک لگ جاتے ہیں۔ مگر معاملات واخلاق کے متعلق جو حصے ہیں، ان سے متعلق مباحث کو کماحقہ بیان نہیں کیا جاتا۔

طرز تعلیم کا طالب پر اثر

ہمارے اس طرز تعلیم نے یہ بتادیا کہ یہ اتنی اہم چیز نہیں ہے، چنانچہ ان مدارس سے جو طالب علم فارغ ہو کر گیا، اس نے جب یہ دیکھا کہ تعلیم کے دس ماہ میں سے آٹھ ماہ تو عقائد وعبادات پر بحث ہوتی رہی، اور باقی سارا دین صرف دو مہینے میں گزار دیا گیا ہے تو اس نے یہ تأثر قائم کیا کہ عقائد وعبادات کے علاوہ باقی سارا دین ثانوی نوعیت رکھتا ہے، اس کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔

اس میں ایک مجبوری بھی تھی اور وہ یہ کہ دشمنانِ اسلام کی سازش کے نتیجے میں عملی طور پر بازار میں، سیاست میں، دین کی گرفت نہیں رہی تھی، اس پر چونکہ عمل نہیں ہورہا تھا، اس لئے وہ مسائل جن کا تعلق تجارت، سیاست اور دیگر اجتماعی معاملات سے تھا، وہ نظریاتی حیثیت اختیار کرگئے، اور نظریاتی چیز کی طرف طبعی طور پر اتنی توجہ نہیں ہوتی، جتنی کہ اس چیز کی طرف ہوتی ہے جو عملی زندگی میں پائی جارہی ہو۔

یہ عذر اپنی جگہ تھا، لیکن واقعہ یہی ہے کہ ہمارے درس وتدریس کے نظام میں بھی معاملات، اخلاق اور معاشرے کے ابواب بہت پیچھے چلے گئے، یہاں تک کہ اس کے مبادی بھی لوگوں کو معلوم نہیں، اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ، اچھا علم رکھنے والے بھی بعض اوقات مبادی تک سے ناواقف ہوتے ہیں۔ یہ تو ہمارا حال ہے، اور جہاں تک حکومت کا معاملہ ہے تو حکومت چاہے انگریز کی ہو، یا انگریز کے

پروردگان کی ہو، نتائج کے اعتبار سے ابھی تک دونوں میں کوئی فرق واضح نہیں ہوا۔ جو ذہنیت وہاں تھی، وہی ذہنیت یہاں بھی ہے۔

عام مسلمانوں میں دو طبقے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو انگریز کے نظام تعلیم اور اس کی سازشوں کے نتیجے میں اسی کے طرز فکر میں بہہ گیا، اور عملاً دین سے اس نے رشتہ توڑ دیا، چاہے اس نے نام مسلمانوں جیسا رکھا ہے، لیکن عملاً اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ اس نے یہ سوچا کہ مردم شماری کے رجسٹر میں میرا نام مسلمان رہتا ہے تو رہے۔ میرا کوئی نقصان نہیں، مگر کرنا مجھے وہ ہے جو دنیا کر رہی ہے ـــــ یہاں تک کہ اس کو فکر ہی نہیں کہ اس کے عقائد، عبادات اور معاملات درست ہیں یا نہیں۔ گویا عملاً اس نے مذہب کو ایک ڈھکوسلہ سمجھا۔ (العیاذ باللہ)

دوسرا طبقہ عوام کا وہ ہے جو مسلمان رہنا چاہتا ہے، اسلام سے اس کو محبت ہے، دین سے اس کو تعلق ہے، اور وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ دین سے اپنا رشتہ توڑے ـــــ ایسا طبقہ اہل علم کے بھی کسی نہ کسی درجے میں جڑا رہا، لیکن وہ جوڑ زیادہ تر عبادات اور عقائد کی حد تک ہی محدود رہا، اگر اور آگے بڑھا تو نکاح طلاق تک پہنچ گیا اس سے آگے نہیں بڑھ سکا، چنانچہ اگر تمام دارالافتاؤں میں آنے والے استفتاؤں کے اعداد و شمار جمع کئے جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہاں زیادہ تر آنے والے سوالات عبادات، عقائد، نکاح اور طلاق سے متعلق ہوتے ہیں۔ بیوع و دیگر معاملات کے متعلق سوالات نہیں آتے، یا بہت کم آتے ہیں۔

اس کی کیا وجہ ہے؟ حالانکہ یہی وہ لوگ ہیں جو ہم سے عبادات کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ نکاح وطلاق کے متعلق پوچھتے ہیں۔ یہ لوگ تجارت، معاملات اور اپنے ذاتی لین دین کے بارے میں کیوں نہیں دریافت کرتے؟

سیکولر نظام کا پروپیگنڈہ

اس کی ایک وجہ سیکولر ازم کا پروپیگنڈہ ہے کہ دین تو عبادات وغیرہ سے عبارت

ہے، اس سے آگے دین کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، اس پروپیگنڈے کا یہ اثر ہے کہ بہت سے لوگوں کو خیال ہی نہیں ہوتا کہ ہم جو کام کررہے ہیں، آیا جائز کررہے ہیں یا ناجائز کررہے ہیں۔

میں آپ سے ایک بالکل سچا واقعہ عرض کرتا ہوں۔ ایک صاحب میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ بڑے تاجر تھے، ہر وقت ان کے ہاتھ میں تسبیح رہتی تھی، والد صاحب سے وظائف وغیرہ پوچھتے رہتے تھے، اور یہ بھی معلوم تھا کہ تہجد گزار ہیں ــــــ ایک عرصہ دراز کے بعد جاکر یہ بات کھلی کہ ان کا سارا کاروبار سٹے کا ہے، سٹے کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک چھپا ہوا جوا ہوتا ہے، اور دوسرا کھلا ہوا جوا ہوتا ہے، ان کا یہی کاروبار تھا۔ وظائف وغیرہ جو کچھ پڑھتے تھے وہ اس کے نتیجے میں یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ کس سٹے میں کون سا نمبر آئے گا۔

اس سیکولر پروپیگنڈے کا اثر یہ ہوا کہ وہ لوگ جو اگرچہ یہ سمجھتے ہیں کہ معاملات کا بھی حرام وحلال سے تعلق ہے، لیکن اس پورے عرصے میں علماء اور ان کے درمیان اتنی بڑی خلیج حائل ہوگئی ہے کہ ایک طبقہ دوسرے کی بات نہیں سمجھتا۔ ان کا انداز فکر اور، ان کا انداز فکر اور، ان کی زبان اور، ان کی زبان اور، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ایک طبقہ دوسرے طبقے کو بات سمجھانے پر قادر نہیں۔

ہمارے نظام تعلیم میں معاملات کو پس پشت ڈالنے کی وجہ سے علماء کرام میں بھی ایک بڑی تعداد ایسے حضرات کی ہے، جن کو نماز، روزہ، نکاح اور طلاق کے مسائل تو یاد ہوتے ہیں، لیکن معاملات کے مسائل مستحضر نہیں ہوتے، خاص طور پر جو نئے سے نئے معاملات پیدا ہورہے ہیں، ان کے احکام کے استنباط کا سلیقہ نہیں ہے۔ لہٰذا ایک طرف تو تاجر لوگ ایک عالم دین کو اپنی بات نہیں سمجھا سکتے اور اگر سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو کئی گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔ دوسری طرف عالم نے بھی اس سے پہلے اس مسئلے پر غور نہیں کیا، اور نہ ہی اس مسئلے سے کبھی سابقہ پڑا اور

جن فقہی اصولوں کی بنیاد پر اس مسئلے کا حل نکالا جاسکتا ہے وہ مستحضر نہیں، جس کی وجہ سے ایک عالم تاجر کو مطمئن نہیں کرپاتا، اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ان تاجروں نے اپنے ذہنوں میں یہ بات بٹھادی کہ ان مسائل کے بارے میں علماء کے پاس کوئی حل نہیں ہے، اور اس سلسلے میں ان کے پاس جانا فضول ہے، لہٰذا جو سمجھ میں آتا ہے کرو۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ہماری تجارت، معیشت اور سیاست سب سیکولر ڈیموکریسی کے اصولوں پر چل رہی ہیں۔ اور ان میں اسلام کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

عوام اور علماء کے درمیان وسیع خلیج حائل ہوچکی ہے

اور اب تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوچکی ہے کہ ان مسائل میں عوام کے اوپر سے علماء کی گرفت ختم ہوچکی ہے۔ جو عوام صبح وشام ہمارے اور آپ کے ہاتھ چومتے ہیں۔ اپنی دکانوں کا افتتاح، بیٹوں کے نکاح اور اپنے مقاصد کے لئے ہم سے دعا کرواتے ہیں۔ انہی عوام سے اگر علماء یہ کہہ دیں کہ تجارت اس طرح نہیں کرو، بلکہ اس طرح کرو، یا یوں کہا جائے کہ ووٹ مولوی کو دو، تو یہ عوام علماء کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے، کیونکہ دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کے لئے ان علماء سے کماحقہ راہنمائی نہیں ملے گی ـــــ یہ بہت بڑی خلیج ہے جو حائل ہوگئی ہے اور اس خلیج کو جب تک پاٹا اور بھرا نہیں جائے گا اس وقت تک معاشرے کا فساد دور نہیں ہوسکتا۔ اس خلیج کو پاٹنے کے لئے بہت سی جہتوں سے کام کرنے کی ضرورت ہے، لیکن اس وقت یہ میرا موضوع نہیں ہے۔

یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ خلیج پاٹنے کا اظہار بہت سے حلقوں کی طرف سے کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ نو تعلیم یافتہ حلقوں کی طرف سے بھی کیا جاتا ہے، لیکن بقول مولانا احتشام الحق تھانوی کہ "یہ نو تعلیم یافتہ اور تجدد پسند حلقے جو کہتے ہیں کہ اس خلیج کو پاٹو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس خلیج میں مولوی کو دفن کردو تو خلیج پٹ جائے

گی۔

جو اہل زمانہ سے واقف نہیں وہ جاہل ہے

ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم حالات حاضرہ کو سمجھیں کہ ہو کیا رہا ہے؟ حضرات فقہائے کرام رحمہم اللہ کے مدارک بڑے عظیم ہیں۔ انہوں نے اسی لئے فرمایا ہے:

﴿من لم یعرف اهل زمانه فهو جاهل﴾

کہ جو اپنے اہل زمانہ سے واقف نہ ہو، وہ عالم نہیں، بلکہ وہ جاہل ہے، اس لئے کہ کسی بھی مسئلے کا اہم ترین حصہ اس کی صورت واقعیہ (صورت مسئلہ) ہے، اسی لئے لوگوں نے کہا:

﴿ان تصویر المسئلة نصف العلم﴾

جب تک صورت مسئلہ واضح نہیں ہوجاتی، اس وقت تک جواب صحیح نہیں ہوسکتا، اور صورت مسئلہ صحیح سمجھنے کے لئے حالات حاضرہ اور معاملات جدیدہ سے واقفیت ضروری ہے۔ غالباً میں نے امام سرخسی کی کتاب مبسوط میں پڑھا کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ وہ تاجروں کے پاس بازاروں میں جاتے اور یہ دیکھتے کہ تاجر آپس میں کس طرح معاملات کرتے ہیں۔ کسی نے ان کو بازار میں دیکھا تو پوچھا کہ آپ کتاب کے پڑھنے پڑھانے والے آدمی ہیں۔ یہاں کیسے؟ فرمایا کہ میں یہاں اس لئے آیا ہوں تاکہ معلوم کرسکوں کہ تاجروں کا عُرف کیا ہے، ورنہ میں صحیح مسئلہ نہیں بتاسکتا۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی تین عجیب باتیں

تین باتیں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی امام سرخسی نے تھوڑے بہت وقفے سے آگے پیچھے ذکر کی ہیں، تینوں بہت عجیب وغریب ہیں۔ ایک تو یہی جس کا اوپر ذکر ہوا، دوسری یہ کہ کسی نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا آپ نے اتنی کتابیں لکھ دیں:

﴿لم لم تحرر فی الزھد شیئا﴾

لیکن زہد و تصوف میں کوئی کتاب کیوں نہیں لکھی؟ جواب میں آپ نے فرمایا کہ میں نے کتاب البیوع جو لکھی ہے وہ کتاب الزہد ہے۔ تیسری بات یہ کہ کسی نے ان سے پوچھا کہ ہم اکثر و بیشتر آپ کو دیکھتے ہیں کہ ہنسی آپ کے چہرے پر نہیں آتی۔ ہر وقت غمگین رہتے ہیں۔ جیسے آپ کو کوئی تشویش ہو۔ جواب میں فرمایا:

﴿ما باک فی رجل جعل الناس قنطرۃ یمرون علیھا﴾

"اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو جس کی گردن کو لوگوں نے پل بنایا ہو، اور وہ اس پر گزرتے ہوں"۔

ہم نے سازش کو قبول کرلیا

بہرحال، یہ حضرات اہل زمانہ کا عُرف، معاملات اور دوسری چیزیں معلوم کرنے کا اتنا اہتمام فرمایا کرتے تھے تاکہ تصویر مسئلہ معلوم ہو۔ جب ہم لوگ سازش کے تحت بازاروں اور ایوانوں سے الگ کردیئے گئے تو بجائے اس کے کہ ہم اس سازش کو ناکام بنانے کی فکر کرتے، ہم نے خود اسی صورت حال کو قبول کرلیا، وہ اس طرح کہ ہم نے اپنی معلومات، اپنی سوچ اور فکر کے دائرے کو محدود کردیا، جس نے ہم کو سمیٹ لیا، پھر اس سے باہر نکلنے کی ہم نے فکر نہیں کی۔ اس صورت حال کو ختم کئے بغیر ہم اپنے دین کو زندگی کے شعبوں میں برپا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے، یعنی جب تک ہم ایک طرف یہ کوشش نہ کرلیں کہ ان معاملات کا صحیح ادراک ہوجائے، اور ان کا صحیح حکم معلوم ہوجائے، پھر تمام شعبہ ہائے زندگی میں عملی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس وقت تک ہم انقلاب برپا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

تحقیق کے میدان میں اہل علم کی ذمہ داری

شاید یہ کہنے میں مبالغہ نہ ہو کہ ہمارا کام اس سلسلے میں اتنا ادھورا اور ناقص ہے

کہ آج اگر بالفرض یہ کہہ دیا جائے کہ ساری حکومت تمہارے حوالے، تم حکومت چلاؤ، یعنی وزیر اعظم سے لے کر ادنیٰ وزیر تک اور تمام محکموں کے اعلیٰ افسر سے لے کر چپڑاسی تک تم آدمی مقرر کرو تو ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ایک دو روز میں نہیں، ایک دو ہفتوں میں نہیں، ایک دو مہینوں میں بلا ایک سال میں صورت حال بدل دیں ——— ہمیں مسائل کا علم اور ان کی تحقیق نہیں، اور جب تک مسائل کی تحقیق نہ ہو اس وقت تک ان کو نافذ کیسے کیا جائے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اہل علم اس طرف متوجہ ہوں، یہ ان کی ذمّہ داری اور وقت کی اہم ضرورت ہے، لیکن (معاذ اللہ) اس توجہ کے یہ معنی نہیں کہ کوئی تحریف کا کام شروع کردیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ صحیح صورت حال معلوم کریں اور اس کے اوپر صحیح فقہی اصولوں کو منطبق کرکے اس کا حکم معلوم کرکے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

فقیہ کی ذمّہ داری ہے کہ وہ متبادل راستہ نکالے

ایک فقیہ کی صرف اتنی ہی ذمّہ داری نہیں ہے کہ یہ کہہ دے کہ فلاں چیز حرام ہے، بلکہ ہمارے فقہاء کے کلام میں یہ نظر آتا ہے کہ جہاں کہہ دیا "حرام ہے" پھر یہ کہتے ہیں کہ اس کا متبادل راستہ یہ ہے، میں عرض کیا کرتا ہوں کہ قرآن نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے کو بیان کیا ہے ان سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی تھی۔

﴿انی اری سبع بقرات سمان یاکلهن سبع عجاف﴾

(یوسف: ۴۳)

تو حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بعد میں بتلائی، اور تعبیر میں جس نقصان کی اطلاع دی گئی تھی، اس سے بچنے کا طریقہ پہلے بتایا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿قال تزرعون سبع سنین دأبا فما حصدتم فذروه فی سنبله﴾

(یوسف: ۴۷)

فقیہ داعی بھی ہوتا ہے

فقیہ محض فقیہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ داعی بھی ہوتا ہے، اور داعی کا کام محض خشک قانونی کام نہیں ہوتا کہ وہ یہ کہہ دے کہ یہ حلال اور یہ حرام ہے، بلکہ داعی کا کام یہ بھی ہے کہ وہ یہ بتائے کہ یہ حرام ہے، اور تمہارے لئے حلال راستہ یہ ہے۔

ہماری چھوٹی سی کوشش کا مقصد

حلال وحرام کا فیصلہ کر کے حرام کے مقابلے میں لوگوں کو جائز اور حلال راستہ بتانا، بحیثیت داعی فقیہ کے فرائض میں داخل ہے، اور جب تک حالات حاضرہ اور معاملات جدیدہ کا علم نہ ہو، اس وقت تک یہ فریضہ ادا نہیں ہو سکتا، اس لئے میں نے یہ ایک چھوٹی سی کوشش کی ہے کہ اپنے علماء کرام کی خدمت میں معاملات جدیدہ کی حقیقت اور صورت بیان کی جائے، اس دور میں کیا کیا معاملات کس طرح انجام دیئے جارہے ہیں، یہ بیان کیا جائے اس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ یہ فکر عام ہوجائے، اور ہمارے حلقے میں اس کے بارے میں گفتگو شروع ہوجائے، اور ان اہم مسائل کی طرف ذہن منتقل ہوجائے۔

میں نے اس کوچے میں بہت گرد کھائی ہے

میں نے اس کوچے میں بہت گرد کھائی ہے۔ اس لئے کہ میں اس کوچے میں اس وقت داخل ہوگیا تھا جب کوئی اور عالم اس کوچے میں داخل نہیں ہوا تھا، اور میں اسی پریشانی کا شکار رہا جس کا شکار ہونا چاہئے تھا، اس لئے اصطلاحات اجنبی، اسلوب مختلف اور گفتگو کا انداز نیا، کتابیں اگر پڑھیں تو ان کے اندر کسی بات کا سر پیر سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن اس سب کے باوجود دماغ میں شروع سے ایک دھن تھی، اسی دھن کی وجہ سے بہت کتابیں پڑھیں، بہت لوگوں سے رجوع کرنا پڑا، سالہا سال کے بعد جاکر مربوط انداز میں کچھ باتیں سمجھ میں آئیں، اور ایک خلاصہ ذہن میں حاصل

ہوا، وہ خلاصہ طالب علموں کے کام کی چیز ہے۔

اس کورس کی اہمیت کی تازہ مثال

ایک تازہ مثال میں آپ کو بتاتا ہوں جس سے آپ کو اس کام کی اہمیت، فائدہ اور ضرورت کا اندازہ ہوگا، جس طرح ہم نے یہ چھوٹا سا کورس ترتیب دیا ہے اسی طرح ہم نے ایک چھوٹا سا مرکز "مرکز الاقتصاد الاسلامی" کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس کے تحت تاجروں کے لئے ایک کورس حال ہی میں مسجد بیت المکرم (گلشن اقبال) میں ہم نے منعقد کیا، مقصد یہ تھا کہ حلال وحرام سے متعلق جتنی لازمی معلومات ہیں وہ تاجروں کو بتائی جائیں اور موجودہ دور کے جو معاملات چل رہے ہیں، ان میں ان کو شرعی احکام کے اندر رہ کر کیا کرنا چاہئے؟ اس کی نشاندہی کی جائے۔ جب پہلی بار ہم یہ کورس کررہے تھے تو لوگوں نے کہا کہ آپ کیا کرنے جارہے ہو؟ اپنی دکان اور کاروبار چھوڑ کر آپ کے پاس کون آئے گا؟ ہم نے کہا کہ جتنے بھی آجائیں۔چونکہ لوگوں کے لئے مناسب انتظامات اور کھانے پینے کا بندوبست بھی کرنا تھا اس لئے چار سو روپے فی نفر فیس بھی مقرر کی۔

لوگوں کا جذبہ

ہمارے پاس صرف سو آدمیوں کی گنجائش تھی، اور اطلاع کے لئے ہم نے کوئی اشتہار یا اخبار میں خبر نہیں دی، زبانی لوگوں کو بتایا کہ ایسا کورس منعقد ہورہا ہے، اس کے باوجود پہلی مرتبہ ایک سو سات افراد نے پیسے جمع کرا کر اس میں داخلہ لیا۔ اور سب نے باقاعدہ سفارشیں کروائیں کہ ہمیں بھی داخلہ دے دیا جائے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ جو امریکہ جارہے تھے اور ٹکٹ کرواچکے تھے انہوں نے اپنی سیٹیں منسوخ کروائیں اور اس کورس میں شریک ہوئے۔

مسلمان کے دل میں ابھی چنگاری باقی ہے

میں دنیا کے بہت سیمیناروں، مذاکروں اور اجلاسوں میں شرکت کرتا رہتا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ لوگ سیمیناروں میں کتنے ذوق، شوق اور دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں ـــــ عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ پہلے گھنٹے میں مثلاً ۱۰۰% (سو فیصد) حاضری رہے گی، دوسرے گھنٹے میں ۹۰% (نوے فیصد) ہوجائے گی اور تیسرے گھنٹے میں ۷۰% (ستر فیصد) ہوجائیگی اور آخر لوگ اس طرح نظر آتے ہیں جیسے بُھٹے میں کہیں کہیں کوئی دانہ نظر آتا ہے ـــــ لیکن ہم نے جو سیمینار منعقد کیا وہاں لوگوں کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ صبح نو بجے سے لے کر پہلے دن عصر تک اور دوسرے دن مغرب تک مسلسل بیٹھے رہے ـــــ سوائے نماز اور کھانے کے وقفے کے ہمہ تن شوق اور پوری دلچسپی سے حصہ لیا، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان کے دل میں ابھی چنگاری ختم نہیں ہوئی، اس کو تھوڑی سی مہمیز کی ضرورت ہے، اگر اس کو صحیح راہنمائی صحیح طریقے سے میسّر آجائے اور اس کو یہ پتہ چل جائے کہ مجھے یہاں سے صحیح راہنمائی مل جائے گی تو آج بھی وہ آنے کو تیار ہے ـــــ کسی شاعر نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔

میرے طائرِ قفس کو نہیں باغباں سے رنجش
ملے گھر میں آب ودانہ تو یہ دام تک نہ پہنچے

اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا خوف

ڈر لگتا ہے کہ کہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے ہماری پوچھ نہ ہوجائے کہ یہ قوم شکاریوں کے جال میں جارہی تھی، تم نے ان کی فکر کیوں نہیں کی؟ مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ انشاء اللہ یہ صورت حال بدلے گی، یہ سازش کی پیداوار اور مصنوعی صورتحال ہے، حقیقی صورت حال نہیں ہے۔ہماری

تاریخ کی چودہ صدیاں اس صورت کی نفی کرتی ہیں۔ اس واسطے کہ اس پورے عرصے میں زندگی کے ہر گوشے میں علماء کا کردار راہنمائی کا کردار ادا کر رہا ہے ــــــــ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی زندگی میں یہ تبدیلی نہ دیکھ سکیں، ہماری اولادیں، اولاد کی اولادیں دیکھیں، لیکن مبارک ہیں وہ جانیں جو اس کوشش میں صرف ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے ہماری جانوں کو اس کام کے لئے قبول فرمائے، آمین۔

انقلاب کی راہ ہموار کرنے میں ہم حصّہ دار بن جائیں

انقلاب آئے گا اس میں کوئی شک نہیں۔ نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿مثل امتی مثل المطر لا یدری آخرہ خیر ام اولہ﴾
(ترمذی، کتاب الامثال، باب مثل امتی مثل المطر)

"میری امت کی مثال بارش کی سی ہے، نہیں معلوم کہ اس کا پہلا حصہ زیادہ بہتر ہے یا آخری حصہ زیادہ بہتر ہے"۔

لیکن اس میں ہم حصہ دار بن جائیں، ہمارے ذریعے سے بھی اللہ تعالیٰ کوئی اینٹ رکھوادے تو ہماری سعادت ہے۔ اگر ہم پیچھے ہٹ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کسی اور کو کھڑا کردیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا محتاج نہیں ہے۔

﴿ان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم﴾ (محمد:۳۸)

"اگر تم پیچھے ہٹ گئے تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئیں گے، جو تمہاری طرح نہیں ہوگی"۔

اور ایک وقت آئے گا کہ یہ مذاق اڑانے والے اور نعرے لگانے والے، ان کی آوازیں بیٹھ جائیں گی، حلق خشک ہوجائیں گے اور انشاء اللہ دین کا کلمہ سربلند ہوگا۔

جدید مقالات سے واقفیت ضروری ہے

اس درس میں ہماری تمام گفتگو فقہ المعاملات پر ہوگی، ہمارے ہاں ہند وپاکستان میں فقہ المعاملات پر فتاویٰ تو ہیں، لیکن کتابیں نہیں ہیں۔عرب ممالک میں علماء نے اس موضوع پر بہت کام کیا ہے، ان میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ تجدد پسند بھی ہیں، اور آزاد بھی ہیں اور بعض صحیح الفکر اور متصلب بھی ہیں۔ میں نے ان حضرات کی کتابیں دارالعلوم کے کتب خانے میں لاکر رکھنے کی کوشش کی ہے اور الحمدللہ، اب خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔ میری گزارش یہی ہے کہ اہل علم کو اس کام سے واقفیت ہونی چاہئے، ان کی کتابوں کو دیکھا جائے اور ان کا مطالعہ کیا جائے۔

عربوں کے کام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک موضوع کو لے کر اس پر پوری کتاب لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً "الخیار" کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس میں خیار عیب، خیار شرط، خیار رویت اور خیار تعیین وغیرہ تمام خیارات سے متعلق مباحث ذکر کردیئے، اور اس کے تحت جتنے جدید مسائل آتے ہیں، ان پر بھی کلام کرتے ہیں، اسی طرح کسی نے "الغبن" کے اوپر کتاب لکھی کہ وہ کیا چیز ہوتی ہے؟ اس کی کیا حقیقت ہے، اور کسی نے "التامین" کے اوپر کتاب لکھ دی وغیرہ وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ ہمارے لئے اس کام کو دنیا وآخرت کی سعادتوں کا ذریعہ بنائے اور ہماری اس کوشش کو قبول فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين